ہو بےخبر سے ولو بخش کو جھنجوڑتا تھا وہیں ان کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگ گئے تھے۔
"سردار بیگم ــــ!" رجائی ان کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔
"کہاں ہے ولو بخش؟" ان کی چیخ نکلی تھی۔
"ہسپتال لے گئے ہیں' بیچارے سے بہت خون بہہ رہا تھا' منڈی کی طرف آنے والی سڑک اس کے خون سے لال ہو چکی ہے۔"
"بس کر رجائی! ہمارا کلیجہ نہ کاٹ۔" سردار بیگم کا دل لرزنے لگا تھا انہوں نے ہاتھ اٹھا کر رجائی کو روک دیا۔
"معافی چاہتی ہوں سردار بیگم! پر میں نے جو سنا وہی آ کر بتایا ہے۔" رجائی شرمندگی سے احساس ہو گیا تھا کہ وہ واقعی ان کے دل پر وار کیے جا رہی تھی۔
"ابتر سے کہو گاڑی نکالے میں بھی ہسپتال جاؤں گی۔" انہوں نے تخت سے پاؤں نیچے اتارتے ہوئے کہا۔
"مہرو کہاں ہے؟" انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔
"بی بی تو شاید سو رہی ہیں۔"
"اتنی بے خبر سو رہی ہے؟" سردار بیگم کو مہرو کی گہری اور بے خبر نیند کا سن کر تعجب ہوا تھا۔
"بھی بے خبر سوئی تھی۔" رجائی افسوس سے بولی۔
"اللہ خیر کرے' منحوس کیسی بدفالیں بک رہی ہے' جا دفع ہو۔" سردار بیگم کو غصہ آ گیا تھا رجائی مسلسل ان کا دل دہلائے جا رہی تھی۔
وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی اور سردار بیگم اپنی چادر وغیرہ نکالنے لگیں' رجائی ان کو غصہ نہ دلاتی تو یہ کام اس نے ہی کرنا تھا۔
تھوڑی دیر بعد وہ اپنے کمرے سے باہر آئیں تو باہر سب ہی ان کے منتظر بیٹھے تھے۔ سب سے پہلے بانو اور نگار آگے بڑھی تھیں۔

"دادی بیگم! ولو بخش ــــ؟" بانو کا لہجہ متفکر تھا۔
"کچھ نہیں ہو گا داد بخش کو' بس اللہ سے اس کی زندگی کی دعا مانگو' وہ دعائیں قبول کرنے والا ہے۔"
انہوں نے خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے اپنی پوتی کو تسلی دی تھی' حالانکہ ولو بخش کی حالت کا سن کر ان کے حوصلے خود ریت کی مانند بکھر رہے تھے اگر داد بخش کو کچھ ہو جاتا تو وہ یقیناً کچی مٹی سے بنی دیوار کی طرح ڈھے جاتیں۔ ان کی شخصیت کی بلند و بالا عمارت ولو بخش کے سہارے ہی تو کھڑی تھی۔ داد بخش ان کی زندگی کا سرمایہ تھا ــــ ان کی عمر بھر کی کمائی اور کون شخص اپنی کمائی اور اپنا سرمایہ لٹتے دیکھ سکتا ہے؟
ان کے دل کے ایک کونے سے اگر داد بخش کی زندگی کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں تو دل کے دوسرے کونے سے غم و غصے کی آگ لپک رہی تھی۔
"اس پہ گولی کس نے چلائی؟" نگار کو تجسس ہو رہا تھا۔
"یہ تو پتہ نہیں چلا بی بی جی' سڑک کے قریب جھاڑیوں میں سے چھپ کر فائر کیے گئے تھے۔ ہم کچھ دور ہی کھیتوں میں کام کر رہے تھے فائر کی آواز سن کر سڑک کی طرف بھاگے تو پتہ چلا ولو بخش کو گولی لگی ہے' وہ اپنی گاڑی کے قریب سڑک پہ گرا ہوا تھا۔"
ان کے گاؤں کے ایک کسان نے ساری بات بتائی۔ ولو بخش کو گولی لگنے والی اطلاع اسی نے آ کر دی تھی اور ابھی تک سردار بیگم کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔
"میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ گولی کس نے چلائی ہے پلو رجائی!" انہوں نے کہتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔
"لیکن دادی بیگم! ان مہرو ــــ؟" بانو بے ساختہ بولی تھی۔
"ہماری واپسی تک وہ اپنی بے خبری کا ماتم کرے گی' باقی کا ہم آ کر سنبھال لیں گے۔" سردار بیگم مہرو کو سمجھا کر رجائی کے ساتھ باہر نکل گئیں اور رفتہ رفتہ سب

وہ وہاں سے ہٹ گئے تھے صرف مہرو اور مہر نگار رہ گئی تھیں۔
"کیا بابا داد بخش کا بچ گیا یا چلا گیا؟" ہاجرہ بیگم بھی آ گئیں۔ ان کے طنزیہ لہجے پہ ان دونوں کو بہت غصہ آیا تھا۔
"اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہی ہو گا۔" بانو چبا کر بولی تھی۔
"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اگر وقت ہی آ گیا ہو تو کیا کیا جا سکتا ہے۔" ہاجرہ بیگم بے رحمی سے بولی تھیں۔
"آپ کو یہ سب کہتے ہوئے اللہ سے خوف نہیں آ رہا؟" نگار نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔
"ارے کیوں بھئی؟ ایسا کیا غلط کہہ دیا میں نے؟" وہ انجان بن کر بولیں۔
"غلط تو آپ نے نہیں کہا لیکن اس وقت ہم یہاں بیٹھ کر کسی دوسرے کی موت و زندگی کی باتیں کر رہے ہیں ہم میں سے کسی کو نہیں پتا کہ ہمارے پاس کتنا وقت ہے۔" ہاجرہ بیگم یکدم مسکرائی تھیں۔
"کیسی بدفالیں منہ سے نکل رہی ہو' میں آج سردار بیگم سے بات کروں گی۔"
"پھر تو مجھے بھی دادی بیگم کو بتانا پڑے گا کہ آپ داد بخش کے بارے میں کیسے سفاک خیالات رکھتی ہیں؟"
نگار نے جان بوجھ کر مہرو کا انداز اپنا کر بولی تھی اور واقعی ہاجرہ بیگم ایک سیکنڈ میں سیدھی ہو گئی۔
"میں بھلا داد بخش کے بارے میں ایسے خیالات کیوں رکھوں گی؟ اتنا اچھا' اتنا سعادت مند تو ہے وہ ــــ؟" ہاجرہ بیگم نے فوراً پینترا بدلا۔
"یہی بات تو ہم آپ کو سمجھاتے ہیں' خیر آپ داد بخش کی زندگی کے لیے دعا کیجیے۔ لیکن دل سے۔" نگار کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہسپتال میں گاؤں کا بہت سے لوگ جمع تھے اور ابھی کی خواتین۔ ولو بخش کی زندگی کے لیے دعا تھی۔ جیسے ہی سردار بیگم ہسپتال پہنچیں وہ سب ان کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور احترام سے سلام کیا تھا۔
"ولو بخش کہاں ہے؟" انہوں نے ان سب کے چہروں کو بغور دیکھا' کسی انہونی کے ڈر سے ـــ!
"اندر آپریشن تھیٹر میں ہے' ڈاکٹر گولی نکال رہے ہیں۔" بشیر الوہار فکرمندی سے بولا۔
"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"
"وہ تو جی ڈاکٹر تسلی ہی دیتے ہیں۔"
"گولی کہاں لگی تھی؟"
"سینے کے اوپر کندھے کے قریب لگی تھی ـــ" بشیر الوہار ولو بخش کے لیے حد سے زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔
"اللہ خیر۔" وہ بے ساختہ کہتی قریب پڑی بنچ پہ بیٹھ گئی تھیں۔
"بڑی بیگم! ولو بخش کیسا ہے؟" قاسم علی راہداری عبور کر کے ان کے قریب آ گیا تھا۔
"تمہیں پتہ چل گیا ہو گا کہ ولو بخش کیسا ہے؟" سردار بیگم نے کھردرے لہجے میں کہتے ہوئے اپنے نواسے کو دیکھا۔
"لیکن یہ سب کس نے کیا ہے؟ گولی مارنے والا کون تھا آخر؟" قاسم علی نے وہی سوال کیا جو باقی سب کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔
"گولی مارنے والا بھی ہم میں سے ہی تھا قاسم علی!" سردار بیگم کے تیر طرح لہجے پہ قاسم علی چونک گیا تھا۔
"کیا مطلب ہے نانی بیگم؟"
"مطلب میں تمہیں پولیس کے سامنے بتاؤں گی' پولیس کو فون کرو' ابھی تک پولیس پہنچی کیوں نہیں؟"
سردار بیگم دل میں کچھ ٹھان چکی تھیں۔
"لیکن نانی بیگم!"
"تم سے جو کہا ہے وہ کرو۔" وہ اس وقت کسی بحث و تکرار کے موڈ میں نہیں تھیں۔
"میں ابھی فون کرتا ہوں۔" قاسم علی اپنی نانی بیگم

کے مزاج سے بخوبی واقف تھا ذرا سی بھی دیر سویر ہو جاتی تو وہ برداشت نہیں کرتی تھیں اور اگر کسی کی بات یا کام میں دیر سویر برداشت کرتی تھیں تو وہ صرف دلو بخش ہی تھا۔

اس نے فون کیا تو پتہ چلا کہ پولیس کو پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کی ڈاکٹر صاحب نے پولیس کو اطلاع دی تھی کیونکہ یہ سراسر پولیس کیس تھا... اور واقعی چند منٹوں بعد پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔

"آپ کی کسی سے کوئی دشمنی ہے کیا؟" ایس ایچ او نے قاسم علی سے پوچھ گچھ کی۔

"نہیں سر! ہماری کسی سے کوئی دشمنی۔"

"ہماری دشمنی ہے انسپکٹر صاحب اور دشمن کو میں اچھی طرح جانتی ہوں آپ نام لکھو' میں لکھواتی ہوں۔" سردار بیگم اٹھ کر پاس آ گئیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" قاسم کو حیرت ہوئی تھی۔

"میں جو کہہ رہی ہوں' ٹھیک کہہ رہی ہوں انسپکٹر صاحب لکھو نام۔" انہوں نے اشارہ کیا اور پھر اپنے دشمن کا نام اور ولدیت درج کروائی تھی۔

قاسم ان کے منہ سے دشمن کا نام سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ اسے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔

"مجرم آج شام سے پہلے پہلے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے' ورنہ میں بہت برا پیش آؤں گی۔" انہوں نے وارننگ دی تھی اور مزید کچھ بھی کہے بغیر وہ پلٹ کر آپریشن تھیٹر کے باہر رکھے بینچ پہ جا کر بیٹھ گئی تھیں اور قاسم علی بس دیکھتا رہ گیا تھا۔

✿ ✿ ✿

"دعا کرو اللہ میرے بیٹے کے سوئے ہوئے بھاگ جگا دے۔" سردار بیگم نے بڑی آس' بڑی حسرت سے کہا تھا اور وہ عورت ان کے چہرے کو دیکھنے لگی تھی۔

یہ عورت سردار بیگم کی حویلی کے باہر بھیک مانگنے آئی تھی ملازمہ نے اسے پیسے دیے تو بولی۔

"اپنی بیگم صاحبہ سے کہو' میں دو دن سے بھوکی ہوں' دو دن سے کھانا نصیب نہیں ہوا' مجھے کھانا کھلا دیں' میری بھوک سے تڑپتی آنتیں انہیں دعا دیں گی۔"

سردار بیگم اس وقت وہیں کھڑی پودوں کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے سنا تو اس بوڑھی عورت کو اندر بلا لیا اور ملازمہ کو کھانا لانے کے لیے کہا۔

"اللہ تیری حویلی آباد رکھے بیگم صاحبہ!" اس عورت نے کھانا کھانے کے بعد جھولی پھیلا کر دعا دی تھی لیکن سردار بیگم کے دل میں تو بس ایک ہی حسرت تھی اللہ ان کے بیٹے کو صاحب اولاد کرے۔

"اللہ تیرے بیٹے کے بھاگ جگائے گا اور ضرور جگائے گا' یہ ایک فقیرنی کی دعا ہے اللہ تیری حویلی کو ہرا بھرا رکھے' تجھے پوتے پوتیوں کی خوشیاں دکھائے۔"

"بی بی شام ہو رہی ہے' تو حویلی میں رک جا۔" سردار بیگم نے اس عورت کو روکنا چاہا۔

"بیگم صاحبہ! فقیر مسافر ہوتا ہے اور مسافر کہیں رکتا نہیں ہے' چلتا ہی جاتا ہے تو نے میرے پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کیا ہے' اللہ تیرے دل کو ٹھنڈا کرے گا۔" وہ فقیرنی سردار بیگم کو دعائیں دیتی ہوئی حویلی سے نکل گئی تھی۔

✿ ✿ ✿

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" ولی محمد اندر زنان خانے میں چلا آیا۔

"اس بوڑھی عورت سے تیرے لیے دعا کروائی ہے' اللہ تجھے اولاد جیسی نعمت عطا کرے... اس حویلی کے سونے آنگن میں بچوں کی آوازیں گونجیں۔" سردار بیگم بیٹے کے لیے دعائیں کرتی نہیں تھکتی تھیں۔

"انشاء اللہ وہ آپ کی دعائیں ضرور سنے گا۔" ولی محمد اپنی ماں کے دلی جذبات سے بخوبی واقف تھے۔

"بیٹا سولہ سال ہو گئے ہیں دعائیں کرتے کرتے اب تو دعائیں بھی تھکنے لگی ہیں۔" سردار بیگم اداس ہو گئیں۔

"ارے نہیں اماں بیگم! اداس اور مایوس نہیں ہوتے' اللہ سے اچھے کی امید رکھنی چاہیے۔" ولی محمد نے ماں کو بانہوں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔

"اس حویلی کا صرف تو ہی وارث ہے اور تیرا دامن اولاد سے خالی دیکھ کر کلیجے سے ہوک اٹھتی ہے ساجدہ اور راشدہ بھی تو ہیں نا؟ دو' دو تین تین بچے ہیں ان کے' قاسم چار سال کا اور رومیزہ تین سال کا ہو رہا ہے۔"

سردار بیگم کو اپنی بیٹیاں اور ان کے بچے یاد آ گئے۔

"مجھے احساس ہے اماں بیگم! لیکن اللہ کے ساتھ کوئی زور زبردستی تو نہیں کی جا سکتی ناں؟ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے' جو اس کی رضا وہ ہمارا نصیب۔"

"اماں بیگم! آپ کی نظروں میں' میں آپ کی مجرم ہوں ناں؟ آپ کو خوشیوں کے رستے کی رکاوٹ۔" رابعہ بی بی ان کے سامنے آ گئی' وہ ان کی باتیں سن چکی تھی۔

"اماں بیگم! آپ کو اگر کسی اور بطن سے اپنی آنے والی نسل کا وارث ملتا ہے تو ٹھیک ہے آپ لے آئیں۔"

رابعہ بی بی نے حوصلہ کر کے کہہ دیا تھا اور ولی محمد کے ساتھ ساتھ سردار بیگم بھی حیران رہ گئیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو بہو؟"

"ہاں اماں بیگم! میں اپنی خوشی کے لیے آپ کی خوشیاں ملیامیٹ نہیں کر سکتی اور یہ صرف خوشی ہی نہیں پوری نسل کا معاملہ ہے' اپنا نام و نشان تو کوئی بھی مٹانا نہیں چاہتا؟"

رابعہ بی بی سچ کہہ رہی تھی اس کے سر پہ ہر وقت ولی محمد کی دوسری شادی کا خوف سوار رہتا تھا وہ بھلا کب تک دل پہ بار اور کیسے رکھ سکتی تھی۔

"لیکن ہم نے کبھی تمہیں تو الزام نہیں دیا نہ ہی کبھی تمہیں رکاوٹ سمجھا ہے' ہم نے تو اپنے اللہ ہی سے مانگا ہے' وہی رب ہے سب کی سننے والا اور سب کو دینے والا۔"

سردار بیگم سچ کہہ رہی تھیں' انہوں نے کبھی بھی اس چیز کے لیے رابعہ بی بی کو مجرم نہیں سمجھا تھا۔

"عورتیں واقعی جذباتی اور جلد باز ہوتی ہیں' اتنی جلدی آپ لوگ مایوس ہو گئیں؟ ابھی تو زندگی پڑی ہے۔"

ولی محمد نے دونوں کو سمجھایا تھا اور وہ تھوڑی دیر کے لیے سمجھ بھی گئی تھیں... فقط تھوڑی دیر کے لیے

✿ ✿ ✿

سردار محمد اور نواز محمد صرف دو ہی بھائی تھے۔ ماں باپ نے زمینوں کا بٹوارہ کرنے کے ساتھ گاؤں کا اور حویلیوں کا بٹوارہ بھی اپنی زندگی میں ہی کر دیا تھا... بڑی حویلی سردار محمد کے نام اور چھوٹی حویلی نواز محمد کے نام کی گئی... بڑی حویلی گاؤں میں داخل ہوتے ہی بڑی شان سے سر بلند کیے کھڑی نظر آتی اور چھوٹی حویلی گاؤں کے دوسرے کونے میں واقع تھی۔

اسی طرح گاؤں کی دائیں طرف کی زمینیں سردار محمد کی ملکیت تھیں اور بائیں طرف کی زمینیں نواز محمد کی۔

ماں باپ نے بٹوارہ بڑے ہی انصاف سے کیا تھا کہ دونوں بھائیوں کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی اور دونوں اپنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اپنی اپنی حویلیوں میں خوشحال اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے... سردار محمد بڑے تھے اس لیے گھر میں' گھر سے باہر اپنے گاؤں اور آس پاس کے علاقے میں بھی انہی کی زیادہ عزت کی جاتی تھی زیادہ واقفیت اور جان پہچان بھی لوگوں کے ساتھ انہی کی تھی۔

سردار محمد بہت اصول پرست اور انصاف پسند آدمی تھے... حق اور سچ بات کا ساتھ دیتے تھے کبھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کی تھی' انہوں نے کبھی اپنے بیٹے کو بھی بیٹیوں پہ ترجیح نہیں دی تھی' کبھی بیٹے اور بیٹیوں میں کوئی فرق نہیں رکھا تھا یہی وجہ تھی کہ ان کے اکلوتے بیٹے ولی محمد نے کبھی ضد نہیں کی تھی' جو کہتے مان لیتا اور ہاں تو ساجدہ بھی لیتی تھی بس راشدہ کی فطرت میں تھوڑی ضد اور ہٹ دھرمی تھی... لیکن وہ اسے بھی ہینڈل کر لیتے تھے... لیکن کسے خبر تھی کہ وہ اپنے بچوں کو بچپن میں ہی چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو

جائیں گے۔

سردار محمد کی ہارٹ اٹیک سے ہونے والی اچانک اور ناگہانی موت نے ان کی بیوی سعادت النساء کو گم صم کرکے رکھ دیا تھا۔۔۔ تین بچوں کا ساتھ بھری جوانی اور لمبا سفر؟ تینوں ذمہ داریاں ہی بڑی کڑی اور بڑی کٹھن تھیں۔۔۔ انہیں حوصلہ چاہیے تھا اور حوصلہ انسان کو وقت اور حالات خود بخود سونپ دیتے ہیں۔۔۔ سو وہ بھری جوانی میں بیوگی کی چادر اوڑھ کر اس طویل سفر پہ اپنے بچوں کے ہمراہ چل پڑیں۔۔۔ اپنے دیور نواز محمد کا سہارا لے کیں تو کل کو ہزاروں افسانے رقم ہو جاتے جبکہ وہ اپنے آپ کو لوگوں کی زبانوں کی زینت نہیں بنا سکتی تھیں۔ انہیں اپنی ہی نہیں اپنے مرحوم شوہر کی عزت بھی بہت عزیز تھی اور اسی عزت اور وقار کے لیے انہوں نے جوانی کی مسافت اکیلے طے کی تھی اور ہمیشہ اپنے آپ کو "سردار بیگم" کہلوایا تھا۔ رشتہ داروں' جاننے والوں اور گاؤں والوں کے لیے جتنے سردار محمد خود اہم تھے اتنی ہی ان کی بیگم "سردار بیگم" اہم تھیں لوگ ان کا اصل نام تقریباً" بھول گئے تھے سب ہی ان کے تکیہ پہ انہیں سردار بیگم ہی کہتے تھے۔۔۔ اولاد جوان ہوئی تو ان کی شادیوں کی فکر نے آن گھیرا۔

ساجدہ کی شادی نواز محمد کے بیٹے کے ساتھ طے تھی۔ سردار بیگم کا ارمان تھا کہ وہ پہلے بیٹے کی شادی کریں لہٰذا انہوں نے بیٹیوں کے فرض سے فارغ ہونے سے پہلے ولی محمد کے لیے رابعہ کا انتخاب کیا تھا۔ رابعہ ساتھ والے گاؤں کے چوہدری کرم اللہ کی بیٹی تھی اور ولی محمد کو پسند بھی تھی سو انہوں نے ذرا دیر نہ کی اور رابعہ کو بیاہ لائیں۔

ولی محمد اور رابعہ کی شادی کے بعد اب بیٹیوں کی باری تھی لیکن راشدہ شادی کے لیے نہیں مان رہی تھی ہزاروں جتن کے بعد پتا چلا کہ راشدہ کسی کو پسند کرتی ہے۔۔۔ وہ کسی مل اونر کا بیٹا تھا اور راشدہ کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔۔۔ اس ستم پہ آکر سردار بیگم کو دھچکا تو لگا لیکن انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔۔۔ وہ مخالفت کرتیں تو یقیناً" بیٹی ہاتھوں سے نکل جاتی اور سارا الزام ان کی پرورش پہ آتا اور ہمیشہ کے لیے داغ لگ جاتا۔۔۔ لہٰذا انہوں نے سمجھداری سے کام لیا اور راشدہ کو اپنی مرضی سے اس کی پسند کے ساتھ رخصت کر دیا۔

ولی محمد کو اعتراض تو ہوا لیکن ماں کے سامنے وہ کچھ بول نہ سکے۔

دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھر کی ہو چکی تھیں۔ دونوں کے بچے تھے اپنے گھروں میں خوش و خرم زندگی جی رہی تھیں انہیں راشدہ کے شوہر اور سسرال والوں کی طرف سے جو خدشے تھے وہ ان پانچ چھ سالوں میں ختم ہو چکے تھے۔۔۔ لیکن ولی محمد کی طرف اولاد کی کمی دیکھ دیکھ کر ان کا دل کڑھتا ہی رہتا تھا۔

✿ ✿ ✿

گاؤں میں میلہ لگا ہوا تھا ہر طرف طرح طرح کے لوگ نظر آرہے تھے۔

"آپ کو کچھ لینا ہے سردار بیگم؟" ان کی ملازمہ رکھی نے پوچھا تو سردار بیگم چونک گئیں۔

"نہیں مجھے بھلا کیا لینا ہے؟ تم کچھ لینا چاہتی ہو تو لے لو۔" سردار بیگم کہہ کر آگے بڑھ گئیں اور رکھی وہیں کھڑی چیزیں دیکھنے لگی بچے جھولے لے رہے تھے اور ساتھ ڈر کے مارے چیخیں بھی مار رہے تھے رکھی اپنی بیٹی رجائی کے لیے چوڑیاں اور پراندے دیکھنے لگی۔

"چپ ہو جا بدنصیب اب رو آ کیوں ہے؟" وہ دونوں اس قدر کرخت آواز پہ ٹھٹکنے پہ مجبور ہو گئی تھیں۔۔۔ وہ شاید دربار کا مجاور تھا جو اس بچے کو بری طرح جھڑک رہا تھا جبکہ وہ بچہ زار و قطار رو رہا تھا۔

"تم اسے کیوں مار رہے ہو؟" سردار بیگم رہ نہ سکیں اور مزار کے برآمدے کے اس کونے میں چلی آئیں جہاں وہ بچہ رو رہا تھا۔

"یہ اس کا نصیب ہے بیگم صاحبہ!" مجاور ان کو دیکھ کر فوراً سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"نصیب؟" وہ کچھ نہ سمجھیں۔

"بیگم صاحبہ یہ لاوارث ہے۔" مجاور بولا لیکن اس کا جملہ سردار بیگم کے دل میں تیر بن کے پیوست ہو گیا تھا۔

"کل میلے میں ایک آدمی اسے لے کر آیا تھا کچھ دیر اسے لے کر میلے میں پھرتا رہا پھر اسے دربار کے اندر بٹھا کر خود کوئی چیز لینے کے بہانے باہر گیا اور پلٹ کر دوبارہ واپس نہیں آیا۔ آس پاس کے سارے گاؤں میں اعلان کروائے ہیں کہ اگر کسی کا بچہ گم ہوا ہے تو آکر نشانی بتا کے لے جائیں لیکن تب بھی کوئی نہیں آیا۔۔۔ ایک گاؤں کا آدمی بتا رہا تھا کہ اس بچے کے ماں باپ مر چکے ہیں پچھلے دو سال سے اپنے ماموں اور مامی کے پاس تھا مامی کافی بدمزاج عورت ہے اور اس کی نفرت اور ظلم و تشدد سے تنگ آکر اس کا ماموں اسے یہاں چھوڑ گیا ہے اور خود بیوی بچوں کو لے کر گاؤں سے ہی چلا گیا ہے۔ شاید اس بچے کے نام کوئی گھر اور زمین بھی تھے جنہیں بیچ کر وہ بھاگ گئے تھے اور یہ۔۔۔ یہ بدنصیب کل سے رو رو کر ہلکان ہو گیا ہے نہ کچھ کھایا ہے نہ سویا ہے ساری رات اسے پیار سے بیٹھ کر سمجھاتے ہوئے گزاری لیکن یہ پھر بھی نہیں سمجھا بس روئے جا رہا ہے۔"

"تم اسے بدنصیب نہ کہو کس کی قسمت میں کیا لکھا ہے یہ ہمیں کیسے پتہ ہو سکتا ہے؟" سردار بیگم نے اس بچے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا تھا۔

"اس کی قسمت ہی تو اسے یہاں لے کر آئی ہے بیگم صاحبہ!" مجاور کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"اور اس کی قسمت ہی اسے کہیں اور لے جائے گی۔" وہ آہستگی سے بولیں۔

"یہ میرے ساتھ جائے گا میرے گھر' میری حویلی میں۔" سردار بیگم کا لہجہ اٹل تھا۔

"مبارک بیگم صاحبہ! مبارک تیرے بھاگ جاگ گئے ہیں۔ آج' آج اللہ نے تیری جھولی بھر دی' تیری مراد پوری ہو گئی ہے تو نے اک یتیم اور لاوارث کے سر پہ ہاتھ رکھا ہے اللہ تجھے وارث دے گا' جا سکھی رہ عورت اٹھ کر خوشی سے ... ... باتیں ... ... تو وہ بوڑھی عورت اٹھ کر خوشی سے ... دھمال ڈالنے لگی تھی۔ سردار بیگم نے چونک کر دیکھا یہ وہی فقیرنی تھی جو چند دن پہلے ان کی حویلی میں کھانا کھانے آئی تھی۔

"جا اسے اپنے ساتھ لے جا۔" وہ فقیرنی خوشی خوشی کہہ رہی تھی۔

"آپ خوش قسمت ہیں بیگم صاحبہ' آپ کو یہ فقیرنی دعا دے رہی ہے ورنہ اس کے منہ سے سالوں کوئی دعا نہیں نکلتی۔" اس مجاور نے حیرانی اور خوشی سے کہا تھا۔

"چلو میرے بچے میرے ساتھ چلو۔" سردار بیگم نے اس بچے کا ہاتھ تھام لیا۔ سردار بیگم کے انداز میں اتنی محبت اور اپنائیت کا احساس تھا کہ وہ خاموش ہو گیا تھا۔۔۔ وہ اسے بہلاتی ہوئی گاڑی تک لے آئی تھیں اور گاڑی میں بیٹھ کر ان کی نظریں بھی حلوائی کے کھوکھے کی سمت اٹھی تھیں۔

"رکھی یہ لے پیسے اور جلیبیاں لے کر آ۔" انہوں نے پیسے نکال کر رکھی کو دیے۔۔۔ "جلدی کرنا۔"

"وہیں گھر لے آؤ۔" انہوں نے کہا اور سیٹ پہ اپنے قریب بیٹھے بچے کو اپنے قریب کر لیا تھا۔۔۔

"چپ ہو جاؤ شاباش' تمہیں رونے کی اور ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' تم اب میرے بیٹے ہو۔" سردار بیگم نے اس کا سر تھپکا پھر کچھ خیال آنے پہ ٹھٹک گئیں۔

"بیٹا! تمہارا نام کیا ہے؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

"ولی۔۔۔ ولو بخش!" سسکیوں کی وجہ سے اس نے اٹک اٹک کر بتایا تھا۔ "ماشاء اللہ نام تو بہت ہی پیارا ہے۔"

"اپنے ابا کا نام پتا ہے؟"

"جی ان کا نام خدا بخش تھا۔"

"اور ماں کا نام؟"

"سیکھ لیتا ہے۔"
"ہوں، تم بھی سیانے ہو۔" وہ کھل کے مسکرائیں۔
اتنے میں رکھی جلیبیاں لے کر آ گئی اور سردار بیگم نے ڈرائیور کو گاڑی اسٹارٹ کرنے کا حکم دیا۔ تمام راستے دلو بخش سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی ہوئی آئی تھیں تاکہ اس کا ڈر زائل ہو جائے!

✿ ✿ ✿

"یہ کون ہے اماں بیگم؟" ولی محمد اپنی ماں کے ساتھ سات سالہ بچے کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔
"یہ دلو بخش ہے' میرا بیٹا بھی اور میرا پوتا بھی۔" انہوں نے قطعیت سے کہا۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ یہ تیرا بھائی بھی ہے اور بیٹا بھی۔" سردار بیگم نے بیٹے کو سمجھایا۔
"مگر کچھ پتہ تو چلے کہ کون ہے؟"
"بتاتی ہوں ابھی بتاتی ہوں' رکھی! تو اسے اپنے ساتھ کچن میں لے جا اور اسے اچھا سا کھانا کھلا۔" انہوں نے اسے رکھی کے حوالے کیا۔
اور دلو بخش کے بارے میں جان کر اسے بھی افسوس ہوا تھا اور ماں کے فیصلے پہ تھوڑی پریشانی بھی ہوئی تھی۔
"اگر کل کو کوئی مسئلہ کھڑا ہو گیا تو؟" اس نے سردار بیگم کو کہا۔
"کیسا مسئلہ؟"
"کہیں سے اس کے وارث پیدا ہو گئے تو؟ میرا مطلب ہے کہ اس کے دور کے ماموں اور ممانی کہیں سے آ گئے تو پھر آپ کیا کریں گی؟" ولی محمد نے ماں کو ممکنہ باتوں سے آگاہ کیا۔
"پھر کی پھر دیکھی جائے گی اور اگر اس کے ماموں اور ممانی آ گئے تو ان سے حشر کروں گی کہ واپسی کا رستہ بھی بھول جائیں گے کم بختوں نے اس معصوم پہ اتنے ظلم کیے' ماں باپ کا بچہ تھا انہیں ترس بھی نہیں آیا؟" ان کے ارادے بڑے خطرناک تھے ولی محمد بے ساختہ مسکرا اٹھا۔
"ایک خوش خبری ہے آپ کے لیے؟"
"خوشخبری؟" سردار بیگم کا دل دھڑکا۔ "کیسی خوشخبری؟ جلدی بتاؤ۔"
سردار بیگم نے بیٹے کا ہاتھ تھام لیا تھا اور ولی محمد وہیں ان کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔
"اماں بیگم! آپ دادی بننے والی ہیں' ابھی ابھی گاؤں کے ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر بتا کر گئی ہے۔" ولی محمد ان کے دونوں ہاتھ تھام کر عقیدت سے چومتے ہوئے بولا تھا۔
وہ اللہ کے حضور سجدے میں گر گئی تھیں آج اللہ نے واقعی ان کے اور ان کے بیٹے کے بھاگ جگا دیے تھے آج ان کی جھولی بھر گئی تھی ان کی مراد پوری ہو گئی تھی انہیں اس فقیری کی دعائیں اور باتیں فوراً یاد آئی تھیں۔
"رکھی سب کا منہ میٹھا کرواؤ۔" انہوں نے رابعہ بی بی کے سر سے پیسے وار کر دیتے ہوئے کہا تھا پھر رابعہ بی بی کو اپنے گلے لگا لیا۔
"یہ کون ہے؟ یہ میرا دلو بخش ہے' بہو!" سردار بیگم نے اگلے دو دن تک خوشی منائی تھی اور صدقے اور خیراتیں دی تھیں' پورے گاؤں کی عورتیں انہیں مبارک دینے آئی تھیں کہ سردار بیگم کی بہو امید سے ہوئی ہے اور سردار بیگم نے سب کو مٹھائی دے کر رخصت کیا تھا اور سب سے دلو بخش کا تعارف بھی کروایا تھا۔ واپسی پہ سب ہی عورتوں کی زبان پہ دلو بخش کا ہی ذکر تھا!

✿ ✿ ✿

"سوہانو کا کیا مطلب ہے سردار بیگم؟" رابعہ بی بی کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی تھی اور سردار بیگم نے پوتی کا نام سوہانو رکھا تھا لیکن چھوٹے سے دلو بخش کو سوہانو کا نام بہت ہی اچھا لگا تھا اسی لیے مطلب پوچھ بیٹھا۔
"سوہانو کا مطلب ہے 'الفت والی' محبت والی یعنی پیار کرنے والی اپنائیت رکھنے والی۔" انہوں نے دلو مسکرا کر مطلب بتایا۔
ننھی پری رابعہ بی بی کے سامنے کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ "اٹھانا چاہتے ہو تو اٹھا لو۔" انہوں نے اجازت دی۔ "نہیں یہ گر جائے گی۔" اس نے انکار کر دیا اور رابعہ بی بی ہنس پڑیں۔
"بہت سمجھ دار اور سیانا ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔" سردار بیگم نے اس کی بلائیں لے ڈالیں۔
دلو بخش ان کے لیے واقعی خوش قسمت ثابت ہوا تھا۔ سوہانو کی پیدائش کے کچھ ماہ بعد ہی رابعہ بی بی پھر امید سے ہو گئیں اور سردار بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا اور یہی حال ولی محمد کا بھی تھا۔ وہ لوگ اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتے تھے دوسری بیٹی بھی آپریشن سے پیدا ہوئی تھی۔ اب صرف تیسرے آپریشن کی گنجائش تھی۔
سردار بیگم اس بار بھی پوتی کی پیدائش پہ بہت خوش تھیں ان کی ایک پوتے کی' ایک وارث کی امید اب بھی سلامت تھی انہوں نے اس کا نام مہرماہ رکھا تھا۔
"مہرماہ کا کیا مطلب ہے سردار بیگم؟" دلو بخش نے ان سے پوچھا تھا۔
"مہر کا مطلب ہے محبت اور ماہ کا مطلب ہے 'چاند' یعنی مہتاب' عثمانیہ سلطنت کے دسویں حکمران سلطان سلیمان کی اکلوتی صاحبزادی کا نام مہرماہ سلطان تھا' اسے تم محبت کا چاند بھی کہہ سکتے ہو۔"
نو سالہ دلو بخش ان کی بات بڑے غور سے سن رہا تھا اور نظریں سردار بیگم کی گود میں سوئی پانچ دن کی مہرماہ پہ تھیں۔ وہ رابعہ بی بی کو آج ہی ہسپتال سے ڈسچارج کروا کے لائی تھیں۔ ایک سالہ سوہانو بھی ٹک ٹک کر چھوٹی سی مہرماہ کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔
"یہ لو دیکھ لو۔" انہوں نے مہرماہ کو ان دونوں کے سامنے کر دیا اور وہ خوش خوش اسے دیکھنے لگے۔ دلو بخش ان سے پیار کرتا تھا مگر کبھی اٹھانے کی اور ہاتھ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی وہ ڈرتا تھا کہ ان بچیوں کو چوٹ نہ لگ جائے' وہ ان سے دور دور رہتا تھا۔

✿ ✿ ✿

رابعہ بی بی تیسری بار امید سے ہوئیں تو ولی محمد اور سردار بیگم سراپا دعا بن گئے تھے' لیکن شاید دعاؤں کی قبولیت کی گھڑی ابھی نہیں آئی تھی' اللہ نے اس بار پھر انہیں بیٹی جیسی رحمت عطا کی تھی اور ڈاکٹرز نے تیسرے آپریشن کے بعد کسی اور بچے کی گنجائش کو ختم کر دیا تھا گویا سردار بیگم کی آس ختم کر ڈالی تھی۔
ولی محمد بھی چپ چپ سا تھا۔ اسے بیٹی کی پیدائش کا کوئی افسوس نہیں تھا لیکن بیٹے کی کمی بھی اک کسک اک حسرت بن گئی تھی۔ بیٹا ان کی حویلی اور جائیداد کے لیے ضروری تھا۔ ولی محمد بہت چھوٹا تھا جب باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور پھر یہ جاگیرداری خود سردار بیگم کو سنبھالنا پڑ گئی تھی۔ اور اس جاگیرداری کو سنبھالنے کے لیے انہوں نے بڑے پاپڑ بیلے تھے بڑا کٹھن وقت گزارا تھا۔ اب یہ ساری جائیداد اور املاک کس کے ہاتھ میں جانے والی تھی۔
"اماں بیگم! کیا سوچ رہی ہیں؟" ولی محمد نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔
"سوچ رہی ہوں اللہ میری پوتیوں کے نصیب اچھے کرے۔" انہوں نے مہرنگار کی پیشانی پہ بوسہ دیا تھا۔
"آمین!" ولی محمد نے دل کی گہرائیوں سے آمین کہا تھا۔
"مہرنگار کا کیا مطلب ہے سردار بیگم؟" دلو بخش اس بار بھی اپنا سوال نہیں بھولا تھا۔ سردار بیگم دل کھول کے ہنسی تھیں۔
"مہرنگار کا مطلب ہے پیار کا نقش یعنی محبت کا نشان' محبت کی علامت۔" انہوں نے دلو بخش کا گال تھپکتے ہوئے کہا تھا۔
"یہ گڑیا بھی بہت پیاری ہے۔"
"تم گڑیا کو اٹھاتے کیوں نہیں ہو؟"
"رحمانی کہتی ہے گڑیا کو اٹھاؤں گا تو گڑیا گر جائے گی"

اور اسے چوٹ لگے گی۔" داور بخش نے اپنے گریز کی وجہ بتائی۔

"تم احتیاط سے اٹھاؤ گے تو نہیں گرے گی۔" سردار بیگم نے اسے تسلی دی تھی۔ "نہیں سردار بیگم! مجھ سے گر جائے گی۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ تو ولی محمد ہنس دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

بالآخر بیٹے کی کمی نے انہیں اس دوراہے پہ لا کھڑا کیا تھا جہاں ایک آخری فیصلہ کرنا ہر جاگیردار کی مجبوری بن جاتی تھی رابعہ بی بی بھی ان کی مجبوری سمجھتی تھیں سو انہوں نے دل پہ جبر کرتے ہوئے ولی محمد کو شادی کی اجازت دے دی تھی۔۔۔ سردار بیگم خود ایک عورت تھیں عورت کے جذبات بخوبی سمجھتی تھیں انہوں نے رابعہ بی بی کی دل آزاری کے خیال سے کبھی بھی ولی محمد پہ دوسری شادی کے لیے دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ ان کی اجازت پہ سردار بیگم کو بڑی حیرانی ہوئی تھی۔

"یہ کیا کیا رابعہ بی بی؟" کچھ انہوں نے حیرت کے مارے ان کو ہاتھ سے پکڑا تھا۔

"اس حویلی کے وارث کی خواہش تو مجھے بھی ہے اماں بیگم!" رابعہ بی بی نے اپنی نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا تھا اور سردار بیگم کو رابعہ بی بی کے حوصلے اور صبر پہ بیک وقت پیار اور ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔

"ان شاء اللہ اس حویلی میں تمہاری حیثیت اور مرتبے میں کوئی کمی نہیں آئے گی جو مقام آج ہے وہی ہمیشہ رہے گا اللہ تمہیں خوش رکھے آباد رکھے۔" انہوں نے رابعہ بی بی کو ساتھ لگا کر ڈھارس بندھائی تھی اور پھر رابعہ بی بی کی رضامندی سے چند دن بعد ہی سردار بیگم اپنی بہن راشدہ کی بیٹی ہاجرہ کو بیاہ لائی تھیں۔

ہاجرہ شہر کی پڑھی لکھی لڑکی تھی اس ماحول میں بڑا مشکل سے ہی ایڈجسٹ ہو پائی تھی اسے حویلی کی بہت سی چیزوں اور بہت سے لوگوں پہ اعتراض ہوا تھا لیکن مقابل سردار بیگم تھیں جن کے سامنے کوئی اعتراض نہیں چل سکتا تھا آگے پیچھے وہ کوئی ناک منہ

چڑھائی رہتی تھیں لیکن سردار بیگم سامنے آجاتیں تو وہ تیر کی طرح سیدھی ہو جاتی تھیں البتہ جب وہ سامنے سے ہٹ جاتیں تو ان کے نخرے دیکھنے والے تھے۔

☆ ☆ ☆

ولی محمد کی ایکسیڈنٹ سے ہونے والی موت سردار بیگم کو ساکت و صامت کر گئی تھی۔ اپنی جوانی میں اپنے شوہر کی موت کا صدمہ اور بڑھاپے میں جوان بیٹے کی موت کا صدمہ۔۔۔ ان کو جیتے جی مار گیا تھا۔ رابعہ بی بی اور ہاجرہ بیگم کا بھی برا حال تھا ولی محمد جو بیٹے کے لیے عرصے سے خواہش مند تھا اس بیٹے کی شکل بھی نہ دیکھ سکا۔

ولی محمد کی وفات کے دس دن بعد ہاجرہ کے ہاں بیٹے نے جنم لیا تھا اور سردار بیگم ولی محمد کے وارث کو دیکھ کر دھاڑیں مار مار کے روئی تھیں۔ اتنا کہ دیکھنے اور سننے والوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ ان کے دکھ پہ ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر دل میں افسوس تھا۔ سردار بیگم کے ارمان دل میں ہی رہ گئے تھے۔ وہ اتنی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہونے والے پوتے کی کوئی خوشی کوئی جشن بھی نہیں منا سکی تھیں۔ دل کا ایک حصہ غم سے لبریز تھا تو دوسرا پوتے کی صورت دیکھ کر خوشی سے معمور ہو رہا تھا۔

غم بھی ادھورا اور خوشی بھی ادھوری۔۔۔ کون سا احساس کس پہ حاوی تھا کچھ احساس ہی نہیں تھا کچھ خبر ہی نہیں تھی۔۔۔ لیکن یہ زندگی کی ریل ہر غم اور ہر خوشی ساتھ لے کر چلتا تھا ان کا بیٹا انہیں کچھ اور ذمہ داریاں سونپ گیا تھا اور ان ذمہ داریوں کو نبھاتے نبھاتے کتنا وقت گزر گیا؟ کبھی پلٹ کر دیکھا تو پتا چلا!

☆ ☆ ☆

مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہوئی تو اس کی نیند خود بخود کہیں بیچ راستے میں ہی رہ گئی تھی وہ خوابوں کے سفر سے واپس لوٹ آیا تھا۔ چہرے سے کمبل ہٹا کر دیکھا تو کمرے میں ہلکے نیلے رنگ کی بتی کی روشنی دکھائی دی تھی جو روز اس کے آنکھ کھلنے پہ نظر آتی تھی۔ یہ

سو اس کے پسندیدہ زیرو بلب کی روشنی تھی وہ دن بھر کی تھکن کے بعد جب اپنے بستر پہ لیٹتا تھا اس مدھم ٹھنڈی میٹھی روشنی میں اسے فوراً ہی نیند آجاتی ہے۔ وہ ہاتھ سے لیمپ کا بٹن دبا کر لیمپ آن کرتا ہوا اٹھ بیٹھا تھا۔

چند منٹوں بعد وضو کر کے گرم چادر کندھوں پہ اوڑھتا ہوا کمرے سے نکل آیا تھا اپنے کمرے کی طرف آنے والی طویل راہداری عبور کر کے وہ لاؤنج کی جالی سے بنے دروازے تک پہنچا اور دروازہ دھکیل کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اس کے کمرے کی طرف جانے والی راہداری کا دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا اور اس طرف باقی سب کی آمد و رفت بہت کم ہوتی تھی یہ الگ تھلگ سا کمرہ اس نے خود اپنے لیے انتخاب کیا تھا حالانکہ سردار بیگم کو خاصا اعتراض ہوا تھا لیکن اس نے وجہ بتا کر انہیں مطمئن کر دیا تھا کہ وہ دن بھر کا تھکا ہارا ہوتا ہے اور حویلی کے تمام مرکزی کمروں میں باہر کے شور ہنگامے کی آواز آسانی سے پہنچتی ہے اور وہ ٹھیک سے سو نہیں پاتا۔

حویلی سے گاؤں کی مسجد تک وہ روزانہ پیدل ہی جاتا تھا اور اس کے قدموں میں تیزی ہوتی تھی کہ کہیں جماعت نہ نکل جائے۔

"السلام علیکم چاچا!" اس نے سب سے پہلے ٹکرانے والے جیرے لوہار کو احتراماً سلام کیا۔

"وعلیکم السلام" چھوٹے چوہدری! وضو کر کے آئے ہو؟"

"ہاں چاچا! میں وضو حویلی سے ہی کر آیا ہوں۔"

"اچھا کیا ہے یہاں پانی ہی کب ملتی ہے؟" وہ مسکرا کر بولے۔

"چاچی کیسی ہے؟ طبیعت ٹھیک ہوئی ان کی؟" داور بخش اپنی جیب سے سفید کروشیے سے بنی ٹوپی نکال کر پہنتے ہوئے بولا۔

"اللہ کا شکر ہے پتر! اب بھلی چنگی ہو گئی ہے۔" اب وہ اس کے ساتھ اندر آگئے۔

نماز کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ مسجد میں بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا واپس حویلی آیا تو وہاں

گھنٹی بجا یہاں اس کی منتظر ہو کھڑی۔

"داور بخش!" وہ حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ مہرو کی آواز سنائی دی۔

"جی بی بی؟" وہ سراپا سماعت بن گیا تھا۔

"مہرو کے کپڑے ٹیلر سے لے آئے تھے؟" مہراں لان میں کھڑی تھی جب گیٹ سے اندر داخل ہوتے داور بخش کو دیکھ کر اسے مہرو کا ہنگامہ یاد آگیا۔

"جی لے آیا تھا۔"

"ٹھیک ہے جاؤ جا کر دے آؤ اس نے اندر ہنگامہ مچا رکھا ہے۔" مہراں نے شکر کا سانس لیتے ہوئے کہا داور بخش کے گیراج میں کھڑی گاڑی کی سمت آگیا تھا اور گاڑی کا بیک ڈور کھول کر پچھلی سیٹ پہ رکھا کپڑوں سے بھرا ہوا شاپر نکال کر اندر چلا گیا۔

"ارے داور بخش! شکر ہے تم آگئے اس لڑکی نے ناک میں دم کر رکھا تھا مجال ہے بات سنو اس کی۔" رابعہ بی بی تنگی سے کہتی وہاں سے اٹھ گئیں۔ داور بخش خاموشی سے سر جھکا کر اوپر آگیا اس کے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا اس نے ہلکی سی دستک دی۔

"کون ہے؟" اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

"آپ کے کپڑے!" اس نے شاپر سامنے کیا۔

"پہلے کہاں تھے یہ کپڑے؟"

"کل میں رات کو لیٹ واپس آیا تھا آپ سو گئی تھیں اس لیے کپڑے گاڑی میں ہی رکھے رہ گئے۔" داور بخش کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"تمہیں کیسے پتہ کہ میں سو گئی تھی؟"

"رات کے دو بجے کا وقت تھا مہرو بی بی!"

"دو بجے اگر تم جاگ سکتے ہو تو کیا میں نہیں جاگ سکتی؟"

"لیکن رات کے دو بجے میں آپ کے کمرے میں نہیں آسکتا تھا۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"رات کے دو بجے تم میرے کمرے میں نہیں آسکتے تو کیا میرے کمرے کے دروازے پہ بھی نہیں آسکتے؟" وہ گھور کے بولی اسے داور بخش کی نیچی نظروں پہ غصہ آرہا تھا۔

"جی بابا جی! نہیں آ سکتا۔" اس نے دو ٹوک جواب دیا۔

اس کا صرف "جی بابا" کہنا اس کی خفگی کا اظہار تھا۔

"میں جاؤں؟" وہ واپسی کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

"ہوں! جاؤ۔" اس نے سر ہلا کر کہا۔

"شکریہ۔" وہ فوراً پلٹ گیا۔

"سنو دلو!" اس نے بے ساختہ آواز دی تو اس کے قدم تھم گئے تھے۔

"جی؟" وہ اس کی سمت پلٹتے ہوئے مختصر بولا۔

مہ پارہ اسے سرتاپا گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سرمئی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس کندھوں پہ اسکن کلر کی گرم چادر اوڑھے وہ اس وقت کہاں سے آیا تھا سراہا بخوبی جاتی تھی۔

"اچھے لگ رہے ہو۔" اس نے دل کا کہا زبان کی نذر کر دیا تھا۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔

"تم جاؤ اب! میں کپڑے چینج کرنے جا رہی ہوں۔" مہ پارہ نے لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے اسے جانے کا کہا اور خود کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ دلو بخش لب بھینچ کر رہ گیا۔

✿ ✿ ✿

"آ جاؤ دلو بخش!" وہ دستک سے ہی پہچان جاتی تھیں! انہوں نے نرمی سے کہا۔

"ادھر آؤ بیٹھو یہاں۔" انہوں نے اپنے جہازی سائز نواڑی پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" سردار بیگم کو دو دن سے بخار تھا۔

"طبیعت تو پہلے سے بہتر ہے لیکن کچھ تھکن اور کمزوری ہو گئی ہے اٹھنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی۔" انہوں نے نقاہت سے کہا۔

"میں آپ کی ٹانگیں اور پاؤں دبا دیتا ہوں۔" اس نے ان کے پاؤں پہ ہاتھ رکھے اور آہستگی سے دبانے لگا۔

"ارے نہیں میرے بچے' یہ تیرا کام نہیں ہے۔" انہوں نے اپنے پاؤں پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔ "بیٹے پاؤں کے پیر دباتے اچھے نہیں لگتے۔" انہوں نے دلو بخش کی گرفت سے اپنے پاؤں نکالنے چاہے۔

"بیٹے ہی تو ماں کے پیر دباتے ہوئے اچھے لگتے ہیں سردار بیگم! وہ عقیدت و محبت رجائی کے ہاتھ میں نہیں ہو گی جو میرے ہاتھ میں ہو گی۔"

"تم بیٹے ہو لیکن مجھے سردار بیگم کہہ کر پل میں غیر بھی کر دیتے ہو۔"

سردار بیگم بارہا کہہ چکی تھیں کہ مجھے اماں بیگم یا دادی بیگم کہا کرو لیکن وہ بچپن سے اب تک ان کو اماں یا دادی کہنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

"میں آپ کو سردار بیگم اس لیے کہتا ہوں کہ آپ کا مجھ پہ رعب ہے۔" وہ ان کو بہلانے کے لیے ذرا شرارت سے بولا تھا۔

"میں سب جانتی ہوں۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولیں۔

"میں نے ڈاکٹر سے ٹائم لے لیا ہے کل آپ میرے ساتھ شہر چلیں گی اور چیک اپ کروائیں گی۔"

"لیکن اب کس لیے چیک اپ کروانا ہے؟ بخار تو اتر گیا ہے۔"

"بخار اتر گیا ہے لیکن کمزوری اور نقاہت تو چھوڑ گیا ہے ناں؟ ڈاکٹر کوئی طاقت کی دوا لکھ دے گا تو آپ کی انرجی بحال ہو جائے گی۔" اس نے حتمی انداز میں کہا اور سردار بیگم اس کی اتنی فکر مندی پہ مسکرا دیں۔

"جیسے تمہاری خوشی۔" وہ اس کی بات سے انکار نہیں کر سکتی تھیں۔

"اماں بیگم!" اچانک دروازہ کھول کر راشدہ بیگم اندر داخل ہوئی تھیں۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" راشدہ بیگم ان کے پلنگ پہ سرہانے کی طرف آ بیٹھی تھیں۔

"مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں کہ آپ کی طبیعت خراب ہے' وہ تو آج جابر و بھابھی نے ذکر کیا کہ اماں بیگم بیمار ہیں۔" راشدہ بیگم خاصی تشویش اور پریشانی ظاہر کر رہی تھیں۔

"اکیلی آئی ہو؟" انہوں نے اس کی فکر مندی نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں' زمیر بھی ساتھ آیا ہے' گھر پہ کوئی ڈرائیور نہیں تھا اس لیے اسے ساتھ لے آئی۔" انہوں نے اپنی روانی اور بے دھیانی میں بتایا۔

"ڈرائیور گھر پہ ہوتا تو پھر نہ لے کر آتیں؟" سردار بیگم نے مطلب اخذ کیا۔

"ارے نہیں نہیں اماں بیگم! ایسی کوئی بات نہیں ہے دراصل وہ اپنی پڑھائی میں بزی ہوتا ہے اس لیے کہیں آنا جانا کم ہی ہوتا ہے۔" راشدہ بیگم نے ذرا سنبھل کر جواب دیا تھا۔

"پڑھائی میں تو سبھی بچے مصروف ہوتے ہیں' پڑھائی پہ تو میں کہتی کہ اپنے بڑے بزرگوں کو شکل ہی مت دکھاؤ۔" سردار بیگم خفا ہو رہی تھیں۔

"میں جاؤں سردار بیگم؟" دلو بخش ان کے پاؤں دبانے کے بعد کھڑا ہو گیا تھا۔

"جاؤ' جیتے رہو' اللہ لمبی عمر عطا کرے۔" ان کے منہ سے دعا نکلی تھی۔

"آپ صبح تیار رہیے گا ناشتا کرنے کے فوراً بعد نکلنا ہو گا۔" وہ ان کو یاد دہانی کروا کر باہر نکل گیا تھا۔

"کہاں جانا ہے اماں بیگم؟" راشدہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر کے پاس۔"

"تو اس کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں لے جاؤں گی' زمیر ہے ناں ہمارے ساتھ۔"

"تم اور زمیر آج ہو لیکن کل نہیں ہو گے پھر کس کے ساتھ جاؤں گی؟"

"کیا مطلب ہے اماں بیگم؟"

"مطلب یہ ہے کہ تم لوگ مہمان ہو' چلے جاؤ گے تو پھر میں کیا کروں گی؟" سردار بیگم کے لہجے میں استہزا تھا۔

راشدہ بیگم کا موڈ بگڑ گیا تھا لیکن وہ خاموش ہو گئیں۔

"السلام علیکم نانی بیگم!" اتنے میں زمیر اندر داخل ہوا۔

"وعلیکم السلام کیسے ہو بیٹے؟" سردار بیگم نے کہا۔

"میں ایک دم فٹ ہوں' آپ سنائیں بخار کم ہوا؟" وہ کرسی کھینچ کر ان کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

"بخار اتر چکا ہے' خوامخواہ تمہاری ماں نے تمہیں زحمت دی۔"

"ارے نہیں نانی بیگم! زحمت کیسی؟ جب بھی یہاں آتا ہوں بڑا اچھا فیل ہوتا ہے۔" زمیر نے کافی خوشگوار لہجے میں کہا تھا جس پہ راشدہ بیگم نے حیرت سے بیٹے کو دیکھا شہر سے یہاں آتے ہوئے تو وہ خاصا بیزار اور خفا ہو رہا تھا لیکن اب اچانک موڈ کی تبدیلی حیرانی کا باعث تھی۔

"اچھی بات ہے بیٹے! آتا جایا کرو۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔

"ضرور ان شاء اللہ اب آیا کروں گا۔"

اس نے وعدہ کیا تھا۔ سردار بیگم مسکرا دیں اور راشدہ بیگم کا موڈ بھی خوشگوار ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے دوسری حویلی فون کر کے صاحبہ بیگم کو بھی بلا لیا تھا' آج رات ان کا یہیں گاؤں میں رکنے کا ارادہ تھا اور اس کے لیے انہیں کمپنی کی ضرورت تھی!

✿ ✿ ✿

رکھی' حویلی کے لان میں لوہے کی بڑی سی انگیٹھی رکھے اس میں خشک تنکے اور خشک لکڑیاں دہکا رہی تھی اور آگ کے شعلے بہت بلند اٹھ رہے تھے۔ دلو بخش' عشاء کی نماز پڑھ کر آیا تھا اس کے ہاتھ پاؤں خنک ہوا کے جھونکوں سے ٹھنڈے ہو رہے تھے وہ اندر جانے کی بجائے وہیں آگ کے قریب لان میں چلا آیا تھا۔

"انگیٹھی کیوں دہکا رہی ہو مائی؟" اس نے دونوں

ہاتھ آگ کے قریب کے سینکتے ہوئے کہا۔

"چٹر! ساجدہ بی بی آئی ہوئی ہیں ناں' ان کو بیٹری کی گرمی اچھی نہیں لگتی اس لیے ان کے واسطے کوئلے لا رہی تھی۔"

"او ہاں' ان کو بیٹری کی گرمائش سے الرجی ہو جاتی ہے۔" دلو بخش کو یاد آگیا۔

"چٹر یہ موئی الرجی کیا ہوتی ہے؟" مائی رکھی نے پوچھا۔ دلو بخش ان کی بات پہ بے بسی سے مسکرایا اور کچھ دور پڑی کرسیوں میں سے ایک کرسی اٹھا کر آگ کے قریب رکھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"مائی الرجی وہی ہوتی ہے جو دلو بخش کو مہرو سے ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے کوفت' بیزاری اور اکتاہٹ بھی کہا جا سکتا ہے۔" ان کے قریب سے ہی مہرو کی آواز سنائی دی تھی۔ دلو بخش چونک گیا تھا وہ بھی لان میں ہی تھی لیکن وہ اندھیرے میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔

"دلو بخش کو کیا ہوتی ہے بی بی؟" مائی رکھی کو کچھ نہ آیا۔

"الرجی! یا مہرو دلو بخش کو دیکھتے ہوئے زور دے کر بولی۔

"مائی بی بی! آپ کو بھی کرسی لا دوں؟" مائی رکھی نے اسے کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

"میں چلتا ہوں اب؟" وہ اٹھنے کے لیے پر تولنے لگا۔

"میرے دل سے بھی چلے جاؤ۔"

وہ جل کر بولی تھی اور پھر پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ دلو بخش وہیں بیٹھا رہ گیا۔ ایک وہ اس لڑکی نے اسے سولی پہ لٹکا رکھا تھا۔ وہ اس کی خود سری سے ڈرتا تھا وہ سردار بیگم کی عمر بھر کی ریاضت مٹی میں نہیں ملانا چاہتا تھا اور وہ تھی کہ ہر بار آڑے آجاتی کی وہ دلو بخش کی قربت اور تنہائیوں سے بھی نہیں ڈرتی تھی لیکن دلو بخش کا خون خشک ہو جاتا تھا۔

رمیز حویلی کے مرکزی دروازے سے نکل کر لان کی سیڑھیاں طے کرتا دلو بخش کے قریب آگیا' دلو بخش اپنی جگہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"السلام علیکم بیٹھیے۔" اس نے اپنی کرسی رمیز کو پیش کی۔

"وعلیکم السلام' لیکن تم کہاں بیٹھو گے؟" رمیز نے اسے کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

"میں دوسری کرسی لے آتا ہوں۔" دلو بخش پلٹ کر گیا اور دوسری اٹھا لایا۔

"دلو بخش! کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں اس حویلی میں رہتے ہوئے؟" رمیز آگ پہ نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"بچپن سے اب تک یہیں تو رہا ہوں رمیز صاحب۔"

"پھر تو تم یہاں سب لوگوں کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو گے؟"

"تقریباً۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"تقریباً کیوں؟"

"اس لیے کہ کبھی کبھی ہم کسی انسان کے ساتھ پوری زندگی بھی گزار لیں تو اسے جان نہیں پاتے' اسے سمجھ نہیں پاتے اور کبھی کبھی پاک لمحہ بھی اک عمر پہ حاوی ہو جاتا ہے۔"

"اچھی ہوئے تم مجھے اک بات بتاؤ' تمہاری پہ مہرو بی بی کیسی ہے؟" رمیز کے اس سوال پہ دلو بخش نے چونک کر دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے دلو بخش! میرا سوال سمجھ میں نہیں آیا؟" اس نے ہنستے ہوئے استفسار کیا۔

"میں کیا بتا سکتا ہوں جی!"

"یہی کہ اس کو کیا پسند ہے اس کے شوق مشاغل کیا ہیں؟"

رمیز نے معنی خیزی سے کہا تھا۔ دلو بخش کا دل چاہا کہہ دے۔

"میں اس کا شوق ہوں اور میں ہی اس کی پسند اور مجھے تنگ کیے رکھنا اس کا مشغلہ ہے اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں کرتی۔"

"دیکھیے رمیز صاحب! میرا کام زیادہ تر حویلی سے باہر ہوتا ہے۔ میرا ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تو ہے نہیں کہ میں ان کے مزاج کو سمجھ سکوں بس اتنا ہی جانتا ہوں وہ بہت اچھی نیچر کی ہیں البتہ تھوڑی ضدی ہیں اکثر غصے پہ اتر جاتی ہیں۔" دلو بخش نے سرسری سے انداز میں بتایا۔

"اوہ! یہ تو بہت بری بات ہے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"یار لڑکیاں ضدی ہوں تو بڑی پرابلم ہو جاتی ہے' لڑکیوں میں سب کچھ ہونا چاہیے ناز' نخرہ' ادائیں' لاڈ پیار' لیکن ضد نہیں ہونی چاہیے۔ میں اس چیز سے سخت الرجک ہوں۔" رمیز نے بڑے دھڑلے سے اپنے واہیات خیالات کا اظہار کیا تھا۔ دلو بخش اپنے اشتعال کو ضبط کر گیا۔

"لگتا ہے کافی تجربہ ہے آپ کو؟" اور جواباً وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"تجربے تو بہت ہیں دلو بخش! بس اب کسی نئے تجربے پہ دل تلا ہے۔" اس نے دلو بخش کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور دلو بخش کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ کنپٹی کی رگیں تن گئی تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کافی ٹائم ہو گیا ہے اب سونا چاہیے۔"

"اتنی جلدی یار؟" رمیز ابھی بیٹھنا چاہ رہا تھا۔

"صبح فجر کی نماز کے لیے بھی اٹھنا ہوتا ہے' جلدی سوئیں گا تو جلدی اٹھوں گا ناں؟" اس نے رسان سے جواب دیا۔

"او کے گڈ نائٹ۔" رمیز بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

"ہائے گڈ مارننگ!" وہ سب اس وقت ڈائننگ روم میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے کہ رمیز بھی وہیں چلا آیا۔

"گڈ مارننگ بیٹھیے بھائی۔" وارث نے اپنے ساتھ والی کرسی پیش کی۔

"تھینک یو برادر۔" رمیز مسکراتے ہوئے اس کا گال کھینچتے بولا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"مامی بیگم! کیسی طبیعت ہے اب؟" اس نے سب پہ اک نظر ڈال کر سردار بیگم کو مخاطب کیا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹے۔۔۔ وہ چائے پیتے ہوئے بولیں اور باقی سب کیسے ہیں؟" رمیز کی نظر اڑتے اڑتے مہرو کے چہرے پہ ٹک گئی۔ وہ سر جھکائے ناشتا کر رہی تھی۔

"پھوپھو! آپ آج یہیں رکیں گی ناں؟" مہرو نے راشدہ بیگم کو کہا۔

"نہیں بیٹا! آج واپس جانا ہوگا' انشاءاللہ دوبارہ چکر لگاؤں گی' تم آج اپنی ساس صاحبہ کو روکو۔" راشدہ بیگم نے اپنی بہن ساجدہ بیگم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مہرو کو چھیڑا۔۔۔ مہرو بچپن سے ہی اپنی پھوپھی ساجدہ کے بیٹے قاسم علی سے منسوب تھی۔

"میں اپنے بچی کے لیے خود ہی رک جاؤں گی۔" ساجدہ بیگم نے پاس بیٹھی مہرو کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا تھا۔

"دیکھا ماما! ساس بہو کا پیار؟ اب آپ بھی اپنے لیے ایک عدد بہو کا انتظام کر لیں۔" رمیز شرارت سے بولا تھا اور راحیل بابا نے چونک کر سردار بیگم کی سمت دیکھا۔ وہ نجانے کیوں۔ دیاں؟ کچھ بھی نہ بولی تھیں اور اس سے پہلے کہ رمیز کچھ پوچھتا' دلو بخش اندر داخل ہوا تھا۔

"آپ ناشتا کر چکی ہیں؟" وہ سردار بیگم سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ دلو بخش نے آگے بڑھ کے ان کو بازو سے تھام لیا۔

"اچھا بیٹا! میں چلتی ہوں' میری واپسی تک تو شاید تم لوگ چلی جاؤ گی۔" انہوں نے راشدہ اور ساجدہ سے کہا اور رمیز کے کندھے پہ ہاتھ پھیر کر پیار کیا اور دلو بخش کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ وہ ان کو گاڑی میں بٹھا رہا تھا کہ پیچھے مہرو بھی تقریباً بھاگتی ہوئی آن پہنچی تھی۔

"میں بھی چلوں گی۔" وہ اپنا پرس سیٹ پہ پھینکتی ہوئی دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"تم کو کہاں جانا ہے بیٹا؟" سردار بیگم نے حیرانی سے استفسار کیا تھا۔

"مجھے آپ کے ساتھ جانا ہے دادی بیگم! میں صرف آپ کے لیے آئی ہوں۔" وہ سردار بیگم سے لپٹ گئی تھی اور وہ اس کے لاڈ پہ شفقت سے ہنس دیں۔

"ٹھیک ہے میرا بچہ۔ چلو داد بخش۔" انہوں نے یونہی ہنستے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے داد بخش کو اشارہ کیا تھا۔

"دادی بیگم! ایک بات تو بتائیں یہ داد بخش اتنا کم کیوں بولتا ہے؟" اس نے سردار بیگم کے کندھے پہ سر رکھتے ہوئے پوچھا۔ نظریں داد بخش پہ تھیں۔ اس کے سوال پہ داد بخش کی نظریں بے ساختہ بیک ویو مرر کی طرف اٹھی تھیں۔

"داد بخش! مہرو کو کیا جواب دوں۔ یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔" سردار بیگم ہنس دیں۔ وہ خاموش رہا۔

"دادا!" مہرو نے پکارا۔

"جی مہرو بی بی!" اس کے جواب میں وہی بنا تلا سا احترام تھا۔

"میں تم سے چھوٹی ہوں مجھے بی بی مت کہا کرو۔" وہ چڑ کر بولی۔

"میں تب سے بڑا ہوں مجھے داد بخش کہا کریں۔" اس نے کہا۔

"مجھے جو اچھا لگتا ہے میں وہی کہوں گی۔" وہ تلخی سے بولی۔

"اور جو مجھے مناسب لگتا ہے میں وہی کہوں گا۔" وہ بھی اپنے کہے پہ قائم تھا۔ "دادی بیگم" اس نے جھنجلا کر سردار بیگم کو دیکھا۔

"داد بخش! میری یہ پوتی بڑی بیوقوف ہے۔" انہوں نے مہرو کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے پیار سے کہا۔

"جی ان کی اس خوبی کے ثبوت ملتے رہتے ہیں مجھے" وہ ذرا آہستگی سے بولا تھا۔

"گاڑی روکو اور مجھے یہیں راستے میں اتار دو، میں واپس حویلی چلی جاتی ہوں۔ مجھے آپ لوگوں کے ساتھ نہیں جانا۔" اس نے ناراضی کا اظہار کیا تھا۔

"شہر آ چکا ہے مہرو بی بی! آپ کو دن میں بخار چڑھا تھا وہ سیدھی نہیں جاتی ہے۔" سردار بیگم مسکرا دیں۔ ہسپتال آ چکا تھا۔

داد بخش نے نیچے اتر کر پچھلی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور پھر انہیں سہارا دے کر اترنے میں مدد دی تھی۔ وہ اپنے مقررہ وقت پہ پہنچے تھے۔ ڈاکٹر اپنے روم میں تھا اس لیے ہسپتال پہنچتے ہی نرس سردار بیگم کو اندر ایکسرے کے لیے لے گئی اور وہ دونوں ویٹنگ روم میں ہی رہ گئے۔ مہرو صوفے میں دھنس کر بیٹھ گئی تھی لیکن داد بخش بیٹھنے کے بجائے گلاس وال کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔ وہاں سے باہر ریسیپشن کا منظر نظر آ رہا تھا۔ ریسیپشن پہ دو لڑکیاں کھڑی تھیں کافی خوب صورت اور اسٹائلش۔ وہ ہسپتال میں نئے آنے والوں کو گائیڈ کر رہی تھیں۔ انتہائی پروفیشنل سا انداز تھا ان کا۔

داد بخش نجانے کیا سوچتے ہوئے بے دھیانی میں ہی ان کی طرف دیکھے گیا تھا۔

"وہ پنک ڈوپٹے والی زیادہ خوب صورت ہے نا؟" اچانک اس کے بے حد قریب سے مہرو کی آواز ابھری تھی۔ داد بخش نے چونک کر دیکھا تھا۔ وہ اس کی نظروں کے تعاقب میں ریسیپشن پہ کھڑی لڑکیوں کو دیکھ رہی تھی۔

"پتا نہیں۔"

"تمہیں کچھ پتا بھی ہے؟" وہ جل کر بولی۔

اتنے میں سردار بیگم بھی چیک اپ کروا کے ایکسرے روم سے نکل آئی تھیں۔

"کچھ کھانے کے لیے بھی لے گیا نہیں؟"

مہرو نے داد بخش پہ نظر ڈال کر کہا لیکن وہ بے نیاز سردار بیگم کو سیڑھیاں اترنے میں مدد دے رہا تھا۔

"تھوڑی دیر پہلے تم ناشتا کر کے ہی تو نکلی ہو نا؟"

"میں ناشتا ادھورا چھوڑ کے آئی تھی دادی بیگم!" وہ ناراضی سے بولی۔

"ابھی داد بخش سے کہتی ہوں کسی اچھے سے ہوٹل میں لے چلتا ہے۔" انہوں نے اسے تسلی دی اور مہرو

اندر ہی اندر خوشی سے ناچنا نہ ہو؟

"داد بخش! گاڑی کسی ہوٹل کے لیے روکنا۔ مہرو کو بھوک لگی ہے۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے تاکید کی تھی۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا اور مہرو آہستگی سے مسکرا دی۔ اسے پتا تھا داد بخش کی جان جا رہی تھی اس حکم کی تعمیل پہ!

☆ ☆ ☆

"باجی بی بی! باجی بی بی! دروازہ کھولیے۔" رجائی نے مہرو کے بیڈ روم کا دروازہ بجایا۔

"کون پیچھے لگ گیا ہے؟ تمہیں آفت کیوں پڑی ہوئی ہے؟" مہرو نے سستی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"وہ نیچے قاسم صاحب آئے بیٹھے ہیں۔" اس کی اطلاع پہ مہرو ٹھٹک گئی۔

"قاسم صاحب؟ باقی سب کہاں ہیں؟"

"نگار بی بی اور منی بی بی کالج گئی ہیں، دلاور شاہ بچے اسکول پڑھنے گیا ہوا ہے۔ سردار بیگم اور راحت بی بی دوسری حویلی گئی ہوئی ہیں اور چھوٹی بیگم، راجی بیگم سو رہی ہیں۔" رجائی نے ساری رپورٹ پیش کیا تھا۔

"اور داد بخش! وہ کہاں ہے؟ اسے بلاؤ۔" مہرو خود قاسم کے سامنے جاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

"وہ زمینوں کی طرف گیا ہے۔ اس نے گلو کو ڈیری بھیجا تھا۔" رجائی کے پاس سب کی خبر تھی۔

"اچھا تم جاؤ، میں آتی ہوں۔" مہرو واپس پلٹی اور اپنا دوپٹا اٹھا کر اچھی طرح اوڑھتی ہوئی باہر نکل آئی۔

"السلام علیکم!" مہرو آہستگی سے بولی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں آپ؟" قاسم علی چونک کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا تھا۔

"جی ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے میں بھی ٹھیک ہوں۔" اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ اس کی پر اشتیاق نظریں مہرو پہ ہی تھیں۔

"آپ اس وقت۔۔۔؟" وہ پوچھتے پوچھتے رک گئی کہیں قاسم برا نہ مان جائے۔

"میں تو شاید نہ ہی آتا مگر قسمت لے آئی۔" قاسم علی اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔

"مطلب؟" مہرو انجان بنی۔

"مطلب کہ میں تین چار روز سے شہر گیا ہوا تھا آج ہی واپسی ہوئی ہے راستے سے گزرتے ہوئے سوچا کہ چلو سب سے ملتے ہوئے جاتا ہوں مگر یہاں آ کر پتا چلا کہ یہاں تو کوئی ہے ہی نہیں سوائے میری قسمت کے۔" قاسم علی کا لہجہ شوخ ہو رہا تھا۔

"یہاں صرف میں ہی نہیں ہوں بھابی امی بھی ہیں۔"

"وہ سو رہی ہیں محترمہ۔" رجائی اسے بتا چکی تھی تب ہی وہ اتنا کھل کے بات کر رہا تھا۔

"وہ سوتے میں بھی آنکھ کھلی رکھتی ہیں۔"

"واہ کیا کوالٹی ہے ان کی۔" قاسم علی ہنسا تھا۔

تب ہی داد بخش ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور مہرو کو قاسم علی کے مقابل والے صوفے پہ بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لیکن پھر اپنی اچانک مداخلت پہ شرمندہ بھی ہو گیا تھا۔

"آئی ایم سوری مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔" وہ شرمندہ سے لہجے میں کہتا واپسی کے لیے پلٹا۔

"داد بخش! تم بیٹھو، گھر پہ اور کوئی بھی نہیں تھا اس لیے مجھے ہی یہاں آنا پڑا۔" مہرو نے جیسے صفائی دی تھی۔

"چائے وغیرہ لی آپ نے؟" داد بخش کو ٹیبل خالی دیکھ کر خیال آیا۔

"تمہاری رجائی بی بی اتنی اچھی میزبان نہیں ہے داد بخش! وہ تو مجھے یہاں سے جانے کا کہہ رہی تھی۔" مہرو نے باہر نکلتے ہوئے اس کا جملہ سنا تھا اور مسکراتی ہوئی کچن کی طرف آ گئی۔

"رجائی! ذرا جلدی ہاتھ چلایا کرو، کام کے وقت تمہاری ساری پھرتی نجانے کدھر جاتی ہے؟" مہرو

رجائی پہ خفا ہوئی۔

"بس بابو جی! سب تیار ہو گیا ہے۔" رجائی ٹرے اٹھاتے ہوئے بولی۔

"گنا بھجوا دیا تم نے؟" قاسم علی رجائی سے چائے کا کپ لیتے ہوئے داد بخش سے مخاطب ہوا تھا۔

"کچھ کل بھجوایا ہے اور کچھ آج۔" داد بخش نے بھی کپ تھام لیا۔

"اس بار بھی شوگر مل کو گنا بھجوانے کا ہمارا ارادہ تھا لیکن پہلا ہاتھ تم نے مار لیا۔" قاسم علی نے کہا۔

"پہلا! ہاتھ نہیں قاسم صاحب! دوسرا ہاتھ، میں پچھلے سال بھی اس شوگر مل میں گنا بھیج چکا ہوں پچھلے سال ہمارا نقصان بھی ہوا تھا ایک ٹرالی کسی کھڈ میں گر گئی تھی۔"

"تم نے وہ پچھلی بار کی کسر اب پوری کر لی ہے۔"

"ظاہر ہے کاروبار میں ہونے والا نقصان کاروبار سے ہی پورا کرنا ہوتا ہے۔ قاسم صاحب! یہ سارا کاروبار، لین دین، کمائی اور خرچہ وغیرہ سردار بیگم کا ہے۔ یعنی میرے لیے ایک امانت ہے اسی لیے مجھے اس امانت کی پائی پائی کا حساب کتاب رکھنا ہوتا ہے۔" اس نے رسانیت سے کہا تو قاسم ہی چپ ہو گئے۔ "اور رہی بات آپ کے ارادے کی تو اگر مجھے پتہ ہوتا تو شاید میں گنا اور فروخت کر دیتا۔" داد بخش نے معذرت کی تھی۔

"ارے کوئی بات نہیں یار! مال تم بھجواؤ یا ہم بات تو ایک ہی ہے ناں؟ اس حویلی میں اور اس حویلی میں کوئی فرق تو نہیں۔" قاسم علی نے سر جھٹکتے ہوئے اطمینان سے کہا اور پھر چائے پینے کے فوراً بعد جانے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ داد بخش اسے گاڑی تک چھوڑنے گیا تھا۔

"تمہارے لیے کھانا لگاؤں؟" رجائی کو پتہ تھا کہ وہ صبح سے زمینوں کی طرف نکلا ہوا ہے اور اس نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا۔

"میں پہلے نہا لوں پھر کھانا کھاتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے ڈرائنگ روم میں کھلنے والے لوہے کی جالی کے دروازے کو کھول کر اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔

اسے واقعی بھوک لگی ہوئی تھی اس لیے وہ نہا کر سیدھا ڈائننگ روم میں آیا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تو چند ہی منٹوں میں رجائی نے کھانا ٹیبل پہ سجا دیا۔

"میرا کھانا.....!" اچانک مہپارہ کی بلند آواز میں صدا ابھری تھی۔ وہ کالج سے لوٹی تھی اور سیدھی ڈائننگ روم میں آئی تھی داد بخش اس کی آواز پہ ٹھٹک گیا۔

"ابھی لگا دیتی ہوں چھوٹی بی بی!" رجائی تیزی سے پلٹ گئی۔ وہ عین اس کے سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ نظریں اسی پہ مرکوز تھیں..... لیکن وہ اپنے دھیان میں مگن کھانا کھانے میں مصروف رہا اس کی کوشش جلد از جلد یہاں سے اٹھنے کی تھی۔

"کھانا کوئی چرا نہیں لے گی۔ کھاتے ہوئے دیکھ تو لیا کرو۔"

"نظر ہی تو ساری تباہی کی جڑ ہوتی ہے۔" وہ سکون سے بولا تھا۔

"تمہیں دیکھنے سے کون سی تباہی ہو جائے گی؟" مہپارہ چبا کر بولی تھی۔

"بس اک نظر کی بدولت ہی تو انسان کے اندر خواہش جاگتی ہے۔" داد بخش کا ہر جواب ہی عجیب تھا۔

"تو کیا تم خواہشوں کے جاگنے سے ڈرتے ہو؟"

"ہاں! ڈرتا ہوں کیونکہ جب انسان کے اندر خواہشیں جاگتی ہیں تو پھر ہر چیز کا اور ہر رشتے کا ڈر اور خوف ختم ہو جاتا ہے۔ انسان اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے۔"

"اتنی پرہیزگاری بھی اچھی نہیں ہوتی داد بخش!"

"اور اتنی بے خوفی بھی اچھی نہیں ہوتی مہپارہ بی بی!" وہ گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے بولا۔

"تم بزدل ہو، اپنی بزدلی چھپانے کے لیے پارسائی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ بزدل مرد کچھ نہیں کر سکتا۔"

"اور بے خوف عورت سب کچھ کر سکتی ہے۔" وہ سخت اور کھردرے لہجے میں کہتا کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"داد.....!" مہپارہ اس کی پشت پہ بلبلا اٹھی تھی۔

"میں داد بخش ہوں مہپارہ بی بی! مجھے داد بخش ہی رہنے دیں، زمین کی خاک کو سر پہ مت چڑھائیں سر پہ پڑی خاک بربادی کی علامت کہلاتی ہے۔ سردار بیگم نے داد بخش کو فرش سے اٹھا کر عرش پہ بٹھا دیا، پلیز! ایسا کچھ مت کیجیے کہ سردار بیگم کو اسی داد بخش کو عرش سے اٹھا کر فرش پہ پھینکنا پڑے، داد بخش نہیں سہا جائے گا۔" وہ کہتے کہتے جیسے کمزور پڑ گیا تھا اور پھر وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔

مہپارہ ششدر سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ داد بخش اپنے آپ کو اپنی ذات کو کس خول، کس دائرے میں رکھتا تھا یہ تو اسے آج پتہ چلا تھا۔

* * *

سنہری دھوپ سہانا لگ رہی تھی اور لوگ سردی سے بچنے کے لیے سنہری دھوپ کا زیور اپنے تن پہ سجانے کے لیے سورج کے سامنے آ کے بیٹھے تھے سو آج سردار بیگم کا تخت بھی حویلی کے لان میں سجا دیا گیا تھا اور چمکیلی دھوپ ان کے ارد گرد حصار باندھ کے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہیں تخت سے نیچے بیٹھی گاؤں کی دو عورتیں بھی ان سے ملنے چلی آئی تھیں۔

"رکھی! آج دھوپ نکلی ہے تو چاول ہی صاف کروا کے رکھوا لو۔" سردار بیگم تکیے کے سہارے ذرا سا اٹھتے ہوئے بولیں۔

"جی سردار بیگم! میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔" رکھی گھٹنوں پہ زور ڈالتے ہوئے بولی۔

"رجائی! مجو اور رفیق سے کہو چاولوں کی بوری نکال کر یہاں رکھ جائیں، میں یہاں کپڑا بچھاتی ہوں۔" رکھی نے ہدایت دی..... رکھی نے بڑا سا موٹا کپڑا بچھایا اور رجائی مجو اور رفیق وغیرہ سے کہہ کر گودام سے چاولوں کی بوری نکلوا کر لے آئی تھی۔

"میں بھی ہاتھ بٹا دوں؟" گاؤں کی ایک عورت نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں نہیں رقیہ! بیٹھو تم، تم مہمان ہو یہاں۔" سردار بیگم نے اس عورت کو روک دیا تھا۔

"یہ تو آپ کا بڑا پن ہے سردار بیگم۔" وہ عورت اتنی عزت پا کر بڑی خوش ہوئی تھی۔

"ہم دونوں آپ کے پاس کسی کام سے آئے تھے۔" اس عورت نے ذرا ٹھہر کر تمہید باندھی۔

"ہاں ہاں بولو کیا کام ہے؟"

"وہ جی دراصل میرا بیٹا گاؤں کے اسکول سے دس جماعتیں پڑھ چکا ہے اب شہر کے کالج میں پڑھنا چاہتا ہے لیکن ہمیں شہر کے کالج میں داخلے وغیرہ کا کچھ بھی نہیں پتا، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس کا داخلہ کروا دیں۔"

انہوں نے ذرا جھجک کے کہا تھا وہ لوگ اتنی چھوٹی سی بات کے لیے اتنا زیادہ پریشان ہو رہی تھیں۔ سردار بیگم مسکرا دیں۔

"تم پریشان نہ ہو میں داد بخش سے کہوں گی وہ تمہارے بیٹے کا داخلہ کروا دے گا بس دسویں جماعت میں اس کے نمبر اچھے ہونے چاہئیں۔"

"یہ لیں چائے!" رجائی ٹرے میں چائے اور بسکٹ سجائے چلی آئی۔ یہ تو اس حویلی کی خصوصیت تھی کہ ہر آنے والے کی عزت اور قدر کی جاتی تھی۔ چاہے وہ کوئی فقیر ہو یا چاہے کوئی کمی کمین، سب سے اچھا کرتی تھیں عزت!

"بہت مہربانی سردار بیگم بہت مہربانی۔" وہ مشکور ہونے لگی تھیں۔

سردار بیگم ان کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں جب حویلی کا گیٹ کھلا اور ایک چمچماتی ہوئی گاڑی اندر داخل ہوئی پھر اس میں سے رمیز کا چہرہ نمودار ہوا تھا۔

"رمیز؟" سردار بیگم اسے دیکھ کر چونک گئیں۔

وہ بیلوں کی باڑھ پھلانگ کر ان کی طرف ہی آ رہا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے قریب آتے ہوئے اونچی آواز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام آؤ میرا بچہ بیٹھو۔" وہ گھٹنی پہ زور دیتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ ان کے پاس تخت پہ ہی بیٹھ گیا تھا۔

"الحمد للہ شکر ہے بیٹا ٹھیک ٹھاک ہوں' تم سناؤ ماں کیسی ہے تمہاری؟"

"وہ بالکل فٹ ہیں' بلکہ آپ کو سلام کہہ رہی تھیں۔" اس نے یاد آنے پہ کہا۔

"وعلیکم السلام' تمہارا باپ کہاں ہوتا ہے آج کل؟ سالوں گزر گئے اس نے تو کبھی شکل ہی نہیں دکھائی؟" انہوں نے والد کے متعلق پوچھا۔ قدرے ہچکچاتے ہوئے جب سے راشدہ کے ساتھ شادی ہوئی تھی ایک یا دو بار ہی گاؤں آئے تھے۔

"پاپا اپنے بزنس میں بزی ہوتے ہیں' کبھی سنگاپور' کبھی ہالینڈ' کبھی امریکا اور کبھی دبئی کتنے کتنے دن تو ہم ان کی شکل نہیں دیکھتے' آپ بھلا کیا دیکھیں گی؟" رمیز دلچسپی سے ہنسا۔

"اور وہ جو تمہاری ماں نے اس کے ساتھ پسند سے شادی کی تھی وہ کیا ہوئی؟ اتنے اتنے دن اپنی شکل نہیں دکھاتا تو اس کی شکل کیا ناک دیکھے گا؟ کیا گھر کی چکنی دکھتی دیواروں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہے؟" وہ لاڈلوں طور تمسخر اڑا رہی تھیں اسی لیے سردار بیگم رمیز کے ساتھ کھل کے بات کر رہی تھیں۔

"وہ گھر بیٹھیں گی تو گھر کی دیواریں دیکھیں گی ناں؟ پاپا سے زیادہ ماما خود بزی ہوتی ہیں۔" رمیز نے کندھے اچکا کر ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکیں۔

"کچھ نہیں' آپ یہ بتائیں باقی سب کہاں ہیں؟" اس نے ٹال دیا تھا۔

"تمہاری پھوپھی اندر ہے' آرام کر رہی ہے' ملنا چاہو تو جا کر مل سکتے ہو' بچیاں کالج گئی ہیں اور وارث اسکول گیا ہوا ہے۔"

"نہیں ابھی تو میں چینج کروں گا' پھر باقی سب سے ملوں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"رہو گے؟"

"جی نانی بیگم' یونیورسٹی سے چھٹیاں تھیں اس لیے سوچا کہ اس بار چھٹیاں آپ کے ساتھ گزاروں گا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ہوں! رجائی سے کہو وہ تمہارے لیے کمرا کھول دے گی۔" انہوں نے اشارہ کیا اور رمیز سر ہلاتے ہوئے اندر آ گیا تھا۔ سردار بیگم دور تک اس کی پشت کو دیکھتی رہیں وہ نجانے کس سوچ میں گم ہو گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اسے کالج کے گیٹ سے باہر کھڑے تو ماٹھنٹہ ہو چکا تھا اس کا انتظار کرتے ہوئے لیکن ابھی بھی اس کی آمد کے دور دور تک بھی امکان نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ کوئی تیسری بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ صہباء یونیورسٹی سے اور سرشار کالج سے فارغ ہو چکی تھیں اسی لیے ابو ان کو لے گیا تھا لیکن صہباء آج تھوڑی لیٹ ہو گئی تھی اس لیے اس کو پک کرنے کی ذمہ داری دلو بخش پہ آ گئی تھی۔

صہباء نے خود اسے کال کر کے کالج سے پک کرنے کا کہا تھا لیکن اب پچھلے آدھے گھنٹے سے اس کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ دلو بخش چاہتا تو اس کے نمبر پہ کال کر کے پوچھ بھی سکتا تھا لیکن وہ خود سے اس کے نمبر پہ کال بھی تو نہیں کرنا چاہتا تھا وہ جس دائرے میں خود کو قید کیے ہوئے تھا بس اسی دائرے میں رہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی آمد میں اتنی تاخیر اسے پریشان بھی کر رہی تھی۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور گیٹ سے باہر کھڑے چوکیدار کے پاس چلا گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ چوکیدار سے کوئی استفسار کرتا اندر سے دوسرے چوکیدار نے گیٹ کھولا اور لڑکیوں کے ٹولے نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ دلو بخش تھوڑا سائیڈ پہ ہو گیا تھا۔

"بائے دلو!" صہباء اسے دور سے ہی دیکھ کر چکی تھی اور وہیں سے ہاتھ ہلایا تھا۔

"یہ دلو کون ہے؟" اس کی ایک کلاس فیلو نے پوچھا تھا۔

"کون ہو سکتا ہے؟" جواباً صہباء شرارت سے بولی تھی۔

"تمہارا منگیتر؟" لائبہ نے قیاس کیا۔ صہباء کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"منگیتر ہے تو نہیں مگر بنا کر ہو جائے۔"

"ہوں! یعنی ابھی کوئی چکر چل رہا ہے؟" وہ معنی خیزی سے بولیں۔

"یار کوشش تو کر رہی ہوں مگر چل نہیں رہا ہے۔"

"امیزنگ یار' تمہاری خوب صورتی تمہاری دلکشی نے اسے متاثر نہیں کیا؟"

"وہ خود کسی سے کم ہے کیا شاہانہ پرسنالٹی ہے۔"

"صرف پرسنالٹی شاہانہ ہے' وہ خود کہیں سے شاہانہ نہیں' استالی خاج' پرمیز گار اور متقی سا بندہ ہے' تمام عورتیں اسے اپنی ماں اور بہن نظر آتی ہیں۔" صہباء استہزائیہ کہتے ہوئے ہنسی تھی۔

"او کے اب چلتی ہوں بے چارہ کب سے انتظار کر رہا ہے۔" صہباء انہیں خدا حافظ کہتی ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گئی۔

دلو بخش نے اس کے لیے بیک ڈور کھول رکھا تھا لیکن وہ بیک ڈور زور سے بند کر کے فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ دلو بخش نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔

"چلو۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ دلو بخش نے اک نظر صہباء کو اور اک نظر گیٹ سے باہر کھڑی اس کی دوستوں کو دیکھا تھا اس لیے خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"تمہیں کافی انتظار کرنا پڑا ہو گا؟" اس نے سکون سے دلو بخش کی طرف رخ موڑا۔

"جی۔" اس نے صرف جی پہ اکتفا کیا تھا۔

"غصہ بھی آیا ہو گا؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"کیوں؟"

"یہ تو میرا کام ہے۔ سردار بیگم پوری عمر کسی کا انتظار کرنے کو کہہ دیں تو پوری عمر بیٹھ کر انتظار کرتا رہوں گا' یہ تو محض چند منٹوں کا انتظار تھا۔"

"تمہاری اپنی مرضی' چاہت کچھ نہیں ہے؟" وہ زومعنی انداز سے بولی۔

"صہباء بی بی! آپ نے اس حویلی میں آنکھ کھولی ہے' یہ سوچ سکتی ہیں' سردار بیگم نے مجھے محبت دی' سہارا دیا۔ میرا سر ہی میرا دل بھی ان کے سامنے جھکتا ہے۔ میں اپنی حیثیت بھولا نہیں ہوں۔" اس نے صہباء کے سوال پر ڈھکے چھپے انداز میں اپنی حیثیت جتا دی تھی۔

"دادی بیگم نے کبھی بھی تم میں اور ہم میں کوئی فرق نہیں رکھا' نہ ذات پات کا' نہ اپنے پرائے کا' جتنا پیار ہم کو دیا اس سے بھی زیادہ تمہیں دیا' ہمیشہ تمہاری بات کو اہمیت دی' ہر ذمہ داری تمہیں سونپی' ہر بھروسہ تم پہ کیا' لیکن تم نے پھر بھی یہ اونچ نیچ اور حیثیت کی دیوار اٹھا رکھی ہے۔ دادی بیگم نے بقول تمہارے تمہیں فرش سے اٹھا کر عرش پہ بٹھا دیا لیکن تمہاری سوچ آج بھی اسی فرش پہ ہے جہاں سے انہوں نے تمہیں اٹھایا تھا۔"

صہباء نے اسے کھری کھری سنا ڈالی تھیں۔

"صہباء بی بی! حقیقت حقیقت ہی رہتی ہے' میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے بھلا' یہ تو سردار بیگم کی ذرہ نوازی ہے کہ انہوں نے مجھ ناچیز کی زندگی کو سنوار دیا اور اب میری زندگی کا بھی یہی مقصد ہے کہ ان کی خدمت میں وقت گزاروں' انہیں سکون اور آرام دوں' نہ کہ میری ذات ان کے لیے پریشانی کا سبب بنے۔"

اس نے کہتے ہوئے سڑک کی ایک سائیڈ پہ گاڑی روک دی اور نیچے اتر آیا تھا۔

"آپ پلیز پچھلی سیٹ پہ آ جائیں۔" اس نے پچھلا دروازہ کھول دیا تھا۔

"کیوں؟"

"آپ جانتی ہیں۔"

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں تمہارے برابر بیٹھنا چاہتی ہوں۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

"میں اس قابل نہیں ہوں۔" وہ بھی اپنی بات پہ قائم تھا۔

صہباء ونڈ اسکرین سے اپنا بیگ اٹھا کر تملاتی ہوئی اپنا غصہ ضبط کرتی فرنٹ سیٹ سے اتر کر پچھلی سیٹ پہ آن

بیٹھی۔ اس کے بیٹھتے ہی داد بخش نے دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ آ گیا پھر پیچھے کا تمام راستہ وہ بالکل خاموش رہی تھی اور اس کی خاموشی اس کے غصے کا اظہار تھی۔ داد بخش نے سکون کا سانس لیا تھا لیکن جیسے ہی اس کی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی وہ ٹھٹک گیا سامنے ہی روش پہ بلیک پجارو کھڑی تھی۔

"رمیز صاحب آئے ہیں؟" اس نے حیرانی سے سوچا اور اس کی پجارو کے پیچھے ہی گاڑی پارک کر دی —

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے جناب، یہاں مہمانوں کو کمپنی دینے کا کوئی رواج نہیں ہے کیا؟" مہرو شال اوڑھے بالکنی میں کھڑی تھی اور اس کے پیچھے رمیز بھی وہیں چلا آیا تھا۔

"نیچے سب لوگوں کی کمپنی کم پڑ گئی تھی کیا کہ آپ کو میری کمپنی کا خیال آ گیا؟"

"یہی سمجھ لو۔" رمیز معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"تو جائیں کسی اور کی آپ کو۔"

"کیوں جناب؟"

"میرا موڈ خراب ہے اس لیے بہتر ہے کہ آپ بھی چپ رہیں اور مجھے بھی چپ رہنے دیں ورنہ بول بیٹھے یہ جناب شاید کتنا اچھا نہیں لگتا احتیاط کیجئے گا۔" اس نے کرارا سا جواب دیا تھا۔

"تو پھر کیا کروں؟"

"مہرو۔۔۔" وہ دو ٹوک بولی۔

"نہیں میں تمہیں یہی کہوں گا جیسے باقی سب کہتے ہیں۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔"

"ویسے تمہارا موڈ کیوں آف ہے؟" رمیز نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں زیادہ پرسنل سوال پسند نہیں کرتی۔" مہرو ناگواری سے بولی تھی۔۔۔ رمیز نے ذرا سا چونک کر اسے دیکھا وہ صرف ضدی اور ہٹ دھرم ہی نہیں خاصی منہ پھٹ بھی لگ رہی تھی اور کسی منہ پھٹ سے محبت کی توقع رکھنا انتہائی عبث تھا۔ رمیز کو خاصا مشکل پراجیکٹ ملی تھی وہ۔۔۔!

"آج تو خاصی روڈ بھی ہو رہی ہو؟"

"پلیز رمیز بھائی!" وہ جھنجھلا کے بولی۔

"صرف رمیز بھی کہہ سکتی ہو۔"

"اوکے اوکے رمیز صاحب پلیز آپ کو برا لگے گا لیکن میں مجبور ہوں آپ سے ٹھیک طرح سے بات نہیں کر پاؤں گی آپ نیچے چلے جائیں۔ بانو اور نگار وغیرہ آپ کو کمپنی دے دیں گی۔"

رمیز کو تاؤ تو آیا تھا لیکن پھر نظر انداز کر گیا۔

"اوکے میں چلا جاتا ہوں لیکن اس امید کے ساتھ کہ صبح تم سے فرینڈلی موڈ کے ساتھ ملاقات ہو گی۔"

رمیز وہاں سے چلا گیا تھا لیکن مہرو وہیں بالکنی میں کھڑی رہی اور اسے کھڑے کھڑے کافی دیر گزر گئی تھی جب بانو اندر داخل ہوئی۔

"کیا بات ہے؟ کیا آج پھر داد بخش کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا ہے؟" بانو نے مہرو سے استفسار کیا تھا۔

"تمہیں کیسے پتہ؟" مہرو نے بانو کو حیرانی سے دیکھا۔

"پوری حویلی میں ایک وہی تو ہے جو تمہاری بات سے اختلاف کرتا ہے یقیناً آج بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہو گا؟ آج تو تم کالج سے اکیلی ہی اس کے ساتھ آئی ہو۔" بانو نے کافی گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا اور درست اندازہ لگایا تھا۔

"مہرو تم جس راستے پر چل رہی ہو انجام سوچا ہے تم نے؟" بانو کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"انجام کوئی بھی نہیں سوچتا اور جو انجام سوچتا ہے وہ آغاز بھی نہیں کرتا۔" وہ بھی مہرو کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

"وہ زمانے اور تھے بابا جب لوگ دل کے کہنے پر چل پڑتے تھے، یہ زمانہ اور ہے یہاں ہر کام باقاعدہ پلاننگ سے اور سوچ سمجھ کر کیا جاتا ہے کیونکہ یہ زمانہ بہت فاسٹ ہے انتہائی تیز رفتار اور تیز دھار۔ یہاں

منہ کے بل گرنے کا اور کچلے جانے کا [illegible] زیادہ ہوتا ہے۔" بانو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ تم اپنی نادانی اور بیوقوفی سے باز آ جاؤ۔"

"جسے تم بیوقوفی اور نادانی کا نام دے رہی ہو۔ وہ میرے دل کی خوشی ہے بانو!" مہرو تڑپ کر بولی تھی۔

"تمہارے دل کی خوشی دادی بیگم کے دل کا آزار بن جائے گی مہرو! اور وہ۔۔۔ وہ مفت میں مارا جائے گا۔ یہ اونچی حویلیوں والے اپنی خود سری پہ الزام نہیں ڈالتے ان کے عتاب کا نشانہ غریبوں کے فرزند بنتے ہیں۔ دادی بیگم ہم سب کے لیے کتنی ہی نرم خو سہی لیکن اس معاملے میں ان کا جلال بھی دیکھنے والا ہو گا اور نشانہ داد بخش ہی بنے گا۔" بانو نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اسے سب صاف صاف بتایا تھا۔ مہرو کتنی ہی دیر کچھ کہہ نہ سکی۔

☆ ☆ ☆

"رجائی! داد بخش کہاں ہے؟ دو دن سے کہیں نظر نہیں آیا؟" مہرو کالج سے واپسی پہ لنچ کرنے کے لیے بیٹھی تو بے ساختہ ہی پوچھ لیا۔ دو دن سے ان دونوں کا کوئی آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔

"اس بے چارے کی تو طبیعت ہی بہت خراب ہے۔۔۔" ماجدہ بیگم ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہوئے اس کی بات سن چکی تھیں لیکن مہرو ان کے جواب پہ بری طرح چونک گئی تھی۔

"کیا ہوا داد بخش کو؟" اس نے دوسری بار بھی رجائی کو ہی مخاطب کیا تھا۔

"دو دن مزدوروں کے پیچھے بھاگ دوڑ کرتا رہا، زمینوں پہ ہل چلانا تھا۔ آدھا کام مزدوروں نے کیا آدھا اس نے خود کیا شام کو گھر واپس آ کر نہانے گھس گیا۔ اتنی مشقت کرنے کے بعد جسم گرم تھا اس لیے ٹھنڈے پانی سے نہانے کی وجہ سے بخار ہو گیا ہے ابھی اسے چائے دے کر آئی ہوں اس کا گلا بھی خراب ہو رہا تھا۔"

رجائی نے کافی تفصیل سے جواب دیا تھا مہرو کی پریشانی وہ جان چکی تھی لیکن ماجدہ بیگم کی موجودگی کے باعث اظہار نہیں کیا۔

"بہت ہی محنتی اور اچھا بندہ ہے داد بخش! سردار بیگم کو ایسا ملازم آنے والی کئی نسلوں میں بھی نہیں ملے گا۔" ماجدہ بیگم نے طنزیہ کہا۔

"داد بخش ملازم نہیں ہے اماں بیگم!" مہرو ان کی طرف رخ موڑتے ہوئے چبا کر بولی تھی۔

"تو پھر کیا ہے؟" انہوں نے تمسخر اڑایا۔

"یہ سوال آپ دادی بیگم سے جا کر کریں۔"

"داد بخش میرا بیٹا ہے، میرا پوتا ہے، میرا نواسا ہے اور کتنے رشتے بتاؤں۔" سردار بیگم کی سماعتوں سے بھی ماجدہ بیگم کی آواز دور نہیں رہ سکی تھی وہ داد بخش کے لیے رجائی کو یخنی بنانے کا کہنے آئی تھیں اور یہ کام ان کے لیے اتنا اہم تھا کہ وہ خود اپنے کمرے سے اٹھ کر یہاں تک آ گئی تھیں۔

"یعنی داد بخش اس حویلی میں وارث کا حصہ دار بن جائے گا۔ جاگیر، جائیداد کا بٹوارہ ہو گا تو وہ بیٹوں کے برابر کا حصہ لے گا۔" ماجدہ بیگم اپنے سینے میں سانپوں سے پھنکار کی طرح اٹھا سوال آج بے ساختہ ہی زبان تک لے آئی تھیں۔

"اس حویلی کی وارث اور حق دار میں خود ابھی زندہ ہوں اور اس حویلی کے وارث اور حق دار کا فیصلہ میں خود کروں گی اور ایک بات کان کھول کے سن لو ماجدہ بیگم! اس حویلی اور جائیداد سے سب کو برابر کا حصہ ملے گا میں چار لوگوں میں بیٹھ کر حصہ کروں گی۔"

سردار بیگم سختی سے کہہ کر رجائی کو لیے وہاں سے چلی گئی تھیں۔ ماجدہ بیگم ناگن کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ بھری جوانی میں بیوگی کے بعد ان کی آنکھوں نے اگر کوئی خواب دیکھا تھا تو وہ اس حویلی اور جاگیر پہ راج کرنے کا خواب ہی تھا، وہ حویلی چھوڑ کر بھی جا سکتی تھیں لیکن اپنے بیٹے کو اور اس حویلی کو چھوڑنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا ان کے تصور میں یہ حویلی اور جائیداد سردار بیگم کے بعد ان کی ملکیت تھی لیکن سردار بیگم تو نجانے کیا کیا سوچے بیٹھی تھیں۔

سو داد بخش نے شال اپنے اوپر لپیٹ لیا تھا۔

"ہر وقت مناسب اور غیر مناسب سے چکروں میں مت پڑا کرو۔ کبھی کسی کے احساسات اور جذبات بھی سمجھ لیا کرو۔" صبا کو اس کی پریشانی اور فکر پہ غصہ آیا تھا۔

داد بخش نے کمبل ہٹا کر پاؤں بیڈ سے نیچے اتارے تھے۔

"اب تم اٹھ کیوں رہے ہو؟"

"میرے سر پہ بدنامی کھڑی ہے اور میں سو رہا ہوں!"

"داد! اب میں تمہارے لیے بدنامی ہو گئی ہوں!" وہ تلملا کر بولی۔

"جہاں کوئی مضبوط رشتہ نہ ہو وہاں بدنامی ہی ہوتی ہے۔ میرے اور آپ کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔" اس نے سلیپر پہنے اور کھڑا ہو گیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" صبا چبا کر بولی اسے غصہ آ رہا تھا۔

"کمرے سے باہر۔"

"تم کہیں نہیں جاؤ گے، باہر بہت ٹھنڈ ہے۔"

"میں آپ کو بھی تو اپنے کمرے سے نہیں نکال سکتا۔" داد بخش نے کرسی پہ رکھی اپنی گرم چادر اٹھائی بخار سے تپتے ہوئے بدن پہ ماحول کی خنکی تیزاب کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

"تم خود بھی کہیں نہیں جا سکتے۔ بیٹھو یہاں۔" صبا نے داد بخش کے سینے پہ ہاتھ رکھ کے اسے پیچھے بیڈ کی طرف دھکیلا تھا۔

"بیٹھو۔" صبا نے اسے بٹھا کر چھوڑا۔

"کمبل اوڑھو اور پاؤں اندر کرو۔" اس نے داد بخش کے پاؤں سے سلیپر بھی نکال دیے تھے لیکن وہ اپنی جگہ پہ دم خود سا رہ گیا تھا۔

ایک عرش پہ اسے سردار بیگم نے بٹھایا تھا اور ایک عرش پہ صبا ولی محمد بٹھا رہی تھی۔ داد بخش کی نظریں صبا پہ گڑی تھیں۔ وہ جو اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا آج آنکھیں پھیلائے اسے دیکھ رہا تھا اس نے نظر اٹھا کر داد بخش کو دیکھا لیکن اسے اپنی طرف ہی دیکھتے پا کر اس کی پلکیں بے ساختہ جھک گئی تھیں۔ وہ سراپا اس کے سامنے تھی اس کی محبت اور ایک عنایت کی منتظر اس کے روم روم سے داد بخش کی محبت کی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہ سراپا سوال بنی ہوئی تھی۔ داد بخش چاہتا تو اپنے کمزوں سے ڈرتے اس کے ہاتھوں پہ اپنے ہاتھ رکھ کر اس کی منتظر محبت کو قبولیت کی سند دے سکتا تھا۔ لیکن اگر وہ یہ چاہتا تو اور بہت کچھ کھو دیتا اور اس بہت کچھ میں سرفہرست سردار بیگم کا اعتبار اور اپنے کردار کا فخر تھا اور وہ ان دونوں چیزوں کو ہی نہیں کھو سکتا تھا بس اسے اس وقت اس لیے کو کھونا تھا سو اس نے کھو دیا۔

وہ صبا ولی محمد کے ہاتھ بے مروتی سے جھٹک کر کھڑا ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے کمرے سے باہر نکل گیا تھا اور صبا اپنی جگہ پہ پتھرائی ہوئی بیٹھی رہ گئی تھی۔

✿ ✿ ✿

وہ لان کے بیچوں بیچ کھڑا انتہائی گہری گہری سانسیں لے رہا تھا ماحول میں شامل دھند کے باعث زمین سے عجیب سی مہک اٹھ رہی تھی اور اس مہک میں بھیگی مٹی کی آمیزش محسوس ہو رہی تھی۔ لان کی گھاس بھیگی بھیگی لگ رہی تھی اور اس دھند کے باعث رات کی سیاہی سرخ دھندلی روشنی میں بدل رہی تھی لان میں ٹہلتے ہوئے اور ایک فیصلے پہ پہنچتے ہوئے کافی دیر لگ گئی تھی۔

فجر کی اذان میں آدھا گھنٹہ رہ گیا تھا۔ اس نے نماز پڑھنے کے لیے بھی جانا تھا اس لیے بہتر تھا کہ یہ کام ابھی ختم کر لیتا۔ اس نے سردار بیگم کے کمرے کے باہر ٹھہرتے ہوئے ایک پل کے لیے سوچا اور پھر دستک دے ڈالی تھی۔ سردار بیگم تہجد کے وقت اٹھتی تھیں اور صبح سورج کی پو پھٹنے تک جاگتی رہتی تھیں اس دوران وہ قرآن پاک نماز اور وظیفہ پڑھتی رہتی تھیں اور اگر اس عبادت سے فارغ ہو جاتیں تو تسبیح لے کر اپنے بستر میں بیٹھ جاتی تھیں۔

✿ ✿ ✿

وہ عجیب سی کشمکش کا شکار تھی، دل بے چینی اور اضطراب کے گھیرے میں تھا، دل جس پہ تنہا تھا دماغ اس پہ اثر انداز ہو رہا تھا۔ سوچیں بھی مضطرب سی محسوس ہو رہی تھیں۔ کافی دیر وہ بستر پہ لیٹی یونہی کروٹیں بدلتی رہی اور پھر آخر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی کچھ اپنے دھیان کو اس کی سوچ سے ہٹانے کے لیے اس نے ایک جتن کیا اور ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ تقریباً پانچ منٹ وہ چینل سرچ کرتی رہی پھر ریموٹ بیڈ پہ اچھال کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی الماری کے پاس گئی اور اپنی گرم شال نکال کر اوڑھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

باہر ہر طرف ملگجا سا اندھیرا پھیل رہا تھا وہ آہستگی سے سیڑھیاں اترتی ڈرائنگ روم میں کھلنے والے دروازے کے پاس آ گئی یہ دروازہ کھلتے اور بند ہوتے ہوئے اچھی خاصی آواز پیدا کرتا تھا اس کی چرچراہٹ دور تک سنائی دیتی تھی۔ صبا نے ہینڈل تھام کر جیسے ہی دروازے کو اپنی طرف کھینچ کر کھولا اس کی نگاہ آواز میں ابھرنے والی چرچراہٹ پورے ڈرائنگ روم میں گونج گئی تھی وہ اس دروازے کو کوستی ہوئی داد بخش کے کمرے کی راہداری میں داخل ہوئی لیکن جیسے ہی ہینڈل کو چھوڑا دروازے نے بند ہوتے ہوئے بھی وہی احتجاج بلند کیا تھا۔

"منحوس!" وہ بڑبڑاتی ہوئی داد بخش کے بیڈ روم کے سامنے آ رکی۔ ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر اپنا موڈ درست کیا اور پھر دروازے پہ ہاتھ سے ہلکا سا دباؤ ڈالا تھا۔

دروازہ کھلتا چلا گیا تھا، داد بخش کبھی بھی اپنے بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند کر کے نہیں سویا تھا۔ گویا اس کا کچھ بھی پرسنل نہیں تھا۔ صبا دبے پاؤں آہٹ کے اندر آ گئی تھی اندر کمرے میں نیلے رنگ کے زیرو بلب کی مدھم سی فسوں خیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کا ماحول خاصا خواب ناک لگ رہا تھا صبا کے دل کی لے بدل گئی تھی۔

وہ دبے قدموں چلتی ہوئی اس کے بیڈ کے قریب آ گئی داد بخش دائیں کروٹ سویا ہوا تھا۔

"داد!" اس نے مدھم سی آواز میں پکارا۔

"داد!" دوبارہ آواز دی گئی لیکن وہ شاید دواؤں کے زیر اثر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ صبا بیڈ کے قریب ہی دبیز قالین پہ بیٹھ گئی۔ اس کے عین سامنے داد بخش کا چہرہ تھا۔ اس کے سیاہ بال اس کی کشادہ پیشانی پہ گرے ہوئے تھے ہر وقت ان کی عزت اور احترام میں جھکی رہنے والی آنکھیں نیند سے ہمکنار تھیں، سیاہ گھنی مونچھوں تلے دبے کٹاؤ دار ہونٹ نرمی سے بھنچے ہوئے تھے اور وہ تھین دن کی بڑھی ہوئی شیو بھی صبا کی کمیں لگاوٹ مخفی نہیں رہ سکی تھی۔

"داد بخش! اللہ نے کس دل کے لعل ہو تم، تمہاری جوانی تو اس نے دیکھی ہی نہیں، دیکھ لیتی تو فخر کرتی تمہیں پیدا کر کے یہ اترائی ہے!"

آہستگی سے اپنا ہاتھ شال سے نکالا اور اس کی پیشانی سے بال ہٹا کر اس کی پیشانی پہ رکھ دیا تھا۔ اس کی پیشانی بری طرح تپ رہی تھی لیکن داد بخش ٹھنڈے ہاتھ کے سرد لمس پہ کرنٹ کھا کے بیدار ہوا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"صبا بی بی؟" اس نے تکیے سے اندھیرے میں بھی اسے پہچان لیا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ میں تمہاری طبیعت پوچھنے آئی تھی۔" صبا نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھا چھوٹا سا لیمپ جلا دیا تھا۔

"میری طبیعت؟ مگر اس وقت؟" اس نے وال کلاک کی سمت دیکھا رات کا ایک بجا تھا۔

"جب فرصت ملے گی تب ہی پوچھوں گی نا؟" اس نے بے نیازی ظاہر کی۔

"لیکن صبا بی بی! اس وقت آپ کا میرے بیڈ روم میں آنا مناسب نہیں، پلیز آپ خود سمجھنے کی کوشش کریں۔" داد بخش کی بخار سے سرخ آنکھوں میں بلال ڈورے تیر رہے تھے اور ابھی نیند ہلکورے لے رہی تھی

وہ شاید کچھ پڑھ رہی تھیں اس لیے دلاور بخش کی دوسری دستک پہ بھی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ اور بالآخر تیسری دستک دینے کے بعد وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ سردار بیگم سامنے ہی جائے نماز پہ بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

انہوں نے آنکھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کا کہا تھا ان کی اجازت۔ کافی بوجھل قدموں سے آگے بڑھ کر کرسی پہ بیٹھ گیا تھا۔

اللہ کے حضور دعا مانگ کر دلاور بخش کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جی ٹھیک ہوں۔"

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

"باہر لان سے۔"

"کیوں خیریت؟ تمہاری تو طبیعت خراب تھی پھر اتنے سرد موسم میں باہر کیوں چلے گئے؟"

دلاور بخش چند ثانیے یونہی خاموش بیٹھا رہا پھر کرسی اٹھا کر جائے نماز کے قریب آ کے بیٹھ گیا اور ہاتھ بڑھا کر سردار بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ حیرانی سے اس کی حرکات نوٹ کر رہی تھیں۔

"آپ کے سامنے کوئی بات کروں تو کیا اس کے لیے قسم کھا کر یقین دلانا ضروری ہے؟" وہ کافی سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہا تھا۔ سردار بیگم کے تجسس میں اضافے کے ساتھ ساتھ پیشانی کی شکنوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟" انہیں حیرت ہوئی تھی۔

"جو میں پوچھ رہا ہوں آپ وہ بتائیں۔" دلاور بخش کا لہجہ اور انداز دو ٹوک ہو رہے تھے۔

"تم خود جانتے ہو کہ تمہاری بات میرے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے اور مجھے کتنا یقین ہے تم پہ؟"

"لیکن یہ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ آپ کا اعتماد ڈول سکتا ہے۔"

"بات جو بھی ہو دلاور بخش! تم پہ میرا یقین اتنا کمزور بھی نہیں کہ ذرا سی بات پہ ڈانواں ڈول ہو جائے۔"

سردار بیگم کا لب و لہجہ مضبوط تھا جس پہ دلاور بخش نے اطمینان سے گہری سانس خارج کی تھی۔

"میں بہت دنوں سے بلکہ بہت عرصے سے یہ بات آپ کے علم میں لانا چاہ رہا تھا لیکن خود میں اتنی ہمت اور حوصلہ نہیں پا رہا تھا کہ آپ کے سامنے یہ سب کہہ پاتا' میں سوچتا تھا کہ سب خود بخود ہی ٹھیک ہو جائے گا' وقت کے ساتھ ساتھ اسے عقل آ جائے گی وہ سمجھ جائے گی لیکن وہ بہت نادان ہے۔ آپ نے مجھ پہ اعتماد کیا' مجھ پہ بھروسہ کیا' اپنی عزتیں' اپنی امانتیں مجھ پہ یقین رکھتے ہوئے مجھے سونپ دیں' میں سب کچھ ہو سکتا ہوں مگر بے غیرت اور بے ضمیر نہیں ہو سکتا کہ آپ کی عزت یا امانت میں کوئی خیانت کروں' میں آپ کی عزتوں کا امین ہوں اور ہمیشہ یہی رہنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میں اس حویلی سے دور ہو جاؤں' میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ اس وقت سے پہلے جب اس حویلی کے مکین مجھے دھکے دے کر نکالیں گے۔"

دلاور بخش کہتے کہتے جیسے تھک گیا تھا اور سردار بیگم ساکت و صامت سی بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ حیرت سے گنگ ہوئی لگ رہی تھیں۔ "کس کی بات کر رہے ہو تم؟" کچھ دیر بعد وہ سرگوشی میں بولیں۔

"مہ جبیں بی بی کی!" ان کے اندیشوں کی تصدیق ہو گئی تھی۔ سردار بیگم جوں کی توں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

"پہلے کبھی کیوں نہیں بتایا؟" ان کی آواز کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"پہلے بات کبھی اس نوبت تک نہیں پہنچی تھی۔"

"نوبت؟" انہوں نے استفساریہ نظروں سے دیکھا۔

"آج رات وہ میرے کمرے میں آئی تھیں میری عیادت کے لیے' مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب آئیں؟ میں دوائیوں کی وجہ سے نیند میں تھا' پتہ تو تب چلا جب مہ جبیں بی بی نے میری پیشانی پہ ہاتھ رکھا۔"

دلاور بخش نے آج سارے راز عیاں کر دیے تھے اور اپنے ضمیر پہ رکھا بوجھ بھی اتار پھینکا تھا۔ اب سردار بیگم چاہے جو بھی فیصلہ سنائیں مگر وہ ہلکا پھلکا ہو چکا تھا اب اس کے ضمیر پہ کوئی بوجھ نہیں تھا کہ وہ سردار بیگم سے کچھ چھپا رہا ہے۔

"آپ پلیز مجھے یہاں سے دور بھیج دیں۔" اس نے پھر کہا تو انہیں کسمسایا تھا۔

"تمہیں کیوں بھیجوں؟ اسے ہی نہ بھیج دوں؟" انہوں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تھا اور دلاور بخش ٹھٹک گیا تھا۔

"کیسے؟"

"جیسے ہر بیٹی ماں باپ کا گھر چھوڑ کے جاتی ہے۔" سردار بیگم کا لہجہ مضبوط اور فیصلہ کن تھا۔ دلاور بخش حیرت سے دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

پچھلے چار پانچ دنوں سے سردار بیگم گہری سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھیں انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنی عزت کو بے داغ کیسے رکھیں؟ لیکن اوپر والا جب چاہتا ہو تو سب ممکن ہو جاتا ہے۔ دس دن ہو گئے تھے رمیز کو واپس شہر گئے ہوئے اور آج دو دن بعد راشدہ بیگم اپنے شوہر قدیر ہمدانی کے ہمراہ حویلی چلی آئی تھیں۔ ماجدہ بیگم اپنے بھائی کو دیکھ کر خوب آؤ بھگت کر رہی تھیں جبکہ راشدہ بیگم آج راجہ بی بی (بڑی بھابھی) پہ فدا نظر آ رہی تھیں۔ انہیں باقاعدہ پیغام بھیج کر کمرے سے ڈرائنگ روم میں بلایا تھا اور انہی سے باتیں کیے جا رہی تھیں اور اس چیز پہ سردار بیگم کو بھی حیرت ہوئی تھی لیکن ایک گھنٹے بعد جب راشدہ بیگم نے اپنا مدعا بیان کیا تو سب کو سمجھ آ گیا تھا یہاں تک کہ ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے دلاور بخش کے قدم بھی تھم گئے تھے۔

"اماں بیگم! آپ جانتی تو ہیں کہ مہ جبیں کے لیے دیا ہوا رمیز کا پروپوزل بھائی جی نے خود قبول کیا تھا جب ساجدہ نے قاسم علی کے لیے مہ جبیں کو مانگا تھا تو میں نے بھی مہ جبیں کی پیدائش کے بعد یہی سوال کیا تھا اور وہ تو بخوشی مان گئے تھے۔"

راشدہ بیگم کی آواز دلاور بخش کی سماعت تک مکمل پہنچ چکی تھی وہ وہیں سے الٹے قدموں واپس پلٹا تھا۔

"مہ جبیں بیٹی ہوئی تو ساجدہ نے اس رشتے کا باقاعدہ اعلان کیا تھا' منگنی کی تھی' پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" سردار بیگم کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔

"میں ایسا کیسے کرتی اماں بیگم؟ آج کل کے بچوں کو آپ جانتی تو ہیں خدا ان کے مزاج کے خلاف بات کرو تو اتنے لمبے دن ان کے موڈ ہی آف رہتے ہیں۔ میں ڈر رہی تھی کہ جانے بچوں کی پسند اور ناپسند کیا ہو گی لیکن شکر ہے کہ رمیز کو خود بخود ہی مہ جبیں کا خیال آ گیا ہے' وہ اسے پسند کرنے لگا ہے شادی پہ آمادہ ہے اور اسی لیے میں آج بھاگی بھاگی چلی آئی ہوں۔" راشدہ نے چہک کر کہا تھا۔

"تم اور تمہارا بیٹا تو آمادہ ہو لیکن یہ بھی دیکھنا ہے کہ صبا اور مہ جبیں کی والدہ کیا کہتی ہیں۔" انہوں نے بیٹی کو دھیمے سُر رکھتے کہا تھا۔

"مگر اماں بیگم! اس میں کہنے نہ کہنے کی بات کہاں سے آ گئی ہے؟ رشتہ تو پہلے ہی ہو چکا ہے راجہ بھابھی بھی جانتی ہیں یہ اسی روز پاس ہی تو تھیں۔" راشدہ بیگم نے حیرت اور تعجب کا اظہار کیا تھا۔

"اس روز اور آج کے روز میں بڑا فرق ہے میری بچی!"

"لیکن اماں بیگم! زبان تو وہی ہے ناں؟" راشدہ نے زور دے کر کہا تھا۔

"زبان دینے والا مر چکا ہے۔" وہ بے تاثر انداز میں بولیں۔ راشدہ بیگم اپنے شوہر قدیر ہمدانی اور پھر راجہ بی بی کو دیکھ کر رہ گئیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں میں' تم یہ رشتہ تقریباً بھلا چکی تھیں اب اچانک کیسے یاد آ گیا؟" اس بار راشدہ تھوڑا سا کھسیا گئیں لیکن پھر سنبھلنے میں بھی چند سیکنڈ ہی لگے تھے۔

"اماں بیگم! وجہ آپ کو بتائی تو ہے۔ میں صرف بچوں کی وجہ سے چپ تھی۔"
"اور اب ہم بھی بچوں کی وجہ سے ہی چپ ہیں۔"
"کیا مطلب ہے آپ کا؟"
"مطلب تمہیں سوچ سمجھ کر بتائیں گے۔"
"مگر اماں بیگم!" راشدہ نے کچھ کہنا چاہا۔
"کچھ وقت دو ہمیں۔" وہ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

✿ ✿ ✿

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" مہرماہ کا دماغ گھوم گیا تھا۔ وہ اک جھٹکے سے صوفے سے کھڑی ہو گئی تھی۔
"یہ ہو چکا ہے۔" مہرماہ نے رسانیت سے کہا۔
"میں رمیز بھائی کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی۔"
"وجہ؟" مہرماہ یوں پوچھ رہی تھی جیسے انجان ہو۔
"وجہ تم جانتی ہو مہرماہ!"
"میں جانتی ہوں ناں؟ ولی بیگم نہیں جانتیں۔" مہرماہ نے کندھے جھٹکے۔
"تو تم بتا دو ناں کو۔"
"میں کسی پہ ظلم نہیں کر سکتی۔"
"ظلم؟ مگر کس پہ؟" مہرماہ کو حیرانی ہوئی۔
"داد بخش پہ۔"
"اس میں داد بخش کہاں سے آگیا؟"
"اس میں داد بخش کو تم ہی تو لے کر آئی ہو ماہی! تمہارے کیے دھرے کی سزا داد بخش کو ملے گی۔ اس کا اس حویلی کے سوا اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ ماہی! اسے ذلیل مت کرو، یہاں سے نکالا گیا تو کہاں جائے گا؟" مہرماہ نے اسے سمجھانے کے لیے ایک بار پھر ناکام کوشش کی تھی۔
"یہاں سے کیوں نکالا جائے گا؟ اگر ولی بیگم کو واقعی اس سے محبت ہے تو وہ اسے کبھی نہیں نکالیں گی۔"
"یہ تو بعد کی بات ہے ناں کہ کیا ہو گا؟ ابھی تو صرف یہ سوچنا ہے کہ ـــــ"
"مہرماہ! میں کچھ بھی سوچنا اور سمجھنا نہیں چاہتی، میں نے جو کہہ دیا ہے بس کہہ دیا ہے میں رمیز بھائی سے شادی نہیں کروں گی، میری طرف سے انکار ہے، میرا انکار ولی بیگم تک پہنچا دینا۔"
وہ کہہ کے وہاں سے چلی گئی تھی اور مجبوراً مہرماہ نے اس کا انکار ولی بیگم کے حضور پیش کر دیا تھا جس پہ انہوں نے مہرماہ کو اپنے کمرے میں طلب کیا تھا اور مہرماہ طلبی پہ بہت سے ڈر لے کے با ادب ان کے حکم پہ حاضر ہو گئی تھی۔
"جی ولی بیگم! آپ نے بلایا تھا مجھے؟" اس نے ان کے روبرو بیٹھتے ہوئے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں پوچھا تھا لیکن اس کی سرکشی کی خوشبو اس کے اک اک انداز سے محسوس ہو رہی تھی۔
"تم نے رمیز کے لیے انکار کیا ہے؟"
"جی ـــــ" اس نے اعتراف کیا۔
"میں تم سے انکار کی وجہ نہیں پوچھوں گی بلکہ یہ پوچھوں گی کہ کیا وہ بھی اس انکار میں شامل ہے، جو اس انکار کی وجہ ہے؟" سردار بیگم کا سوال مہرماہ کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔
"دیکھو میری جان! میں ایک اصول پرست اور انصاف پسند جاگیردار کی بیوی ہوں۔ آج سے بہت سال پہلے راشدہ نے قدیر کو پسند کیا تھا اور مجھ سے چھپایا تھا لیکن جب بات شادی پہ آئی تو اسے اپنا راز کھولنا پڑا ـــــ اس نے چوہدری امتیاز کے رشتے سے انکار کیا تھا لیکن میں نے انکار کی وجہ نہیں پوچھی تھی بلکہ صرف اتنا کہا تھا کہ جس کے ساتھ رخصت ہونا چاہتی ہو اسے اپنے ساتھ لے آؤ، وہ اگر تمہارا ہاتھ مجھ سے مانگ لے ـــــ اس نے قدیر سے رابطہ کیا وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ حاضر ہو گیا انہوں نے ہاتھ مانگا میں نے بیٹی کو دھوم دھام سے اس کے ساتھ رخصت کر دیا۔ کیونکہ مجھے پتا تھا کہ میں اگر انکار یا اختلاف کروں گی تو بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا بلکہ الٹا مجھے ساری زندگی اس کی طرف سے دھڑکا لگا رہے گا اس لیے میں نے وہ دھڑکا بھی ختم کر دیا، عزت اور شرافت سے وہ بات کرتے کرتے ذرا ٹھہر کر گویا سانس لینے کو رکیں۔
"اور آج اتنے سالوں بعد میری پوتی نے بھی یہی انکار کیا ہے۔ اس لیے میں آج بھی انکار کی وجہ نہیں پوچھوں گی، بلکہ یہی کہوں گی کہ جس کے ساتھ رخصت ہونا چاہتی ہو اسے اپنے ساتھ لے آؤ، وہ اگر تمہارا ہاتھ مجھ سے مانگ لے۔"
سردار بیگم نے سپاٹ سے انداز میں کہہ کر بات ہی ختم کر ڈالی تھی اور مہرماہ ہکا بکا سی دیکھتی رہ گئی۔
"لیکن ولی بیگم! ایسے کیسے؟"
"میں نے کہا ناں تم میرے سامنے اس ڈیرے کے کسی کی کو بھی لے آؤ گی تو میں تمہاری شادی اس کے ساتھ کر دوں گی کیونکہ اس حویلی نے کبھی کسی کے قدموں میں قید کی زنجیریں نہیں ڈالیں۔" انہوں نے فیصلہ سنا دیا تھا مہرماہ ششدر سی بیٹھی تھی۔

✿ ✿ ✿

"رجالی! ـــــ رجالی ـــــ! رجالی!" مہرماہ خود پہ ضبط کر کے رجالی کو پکارے جا رہی تھی۔
"جی ماہی بی بی؟" وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی سامنے آئی تھی۔
"داد بخش کہاں ہے؟" اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ رجالی چونک گئی تھی۔
"میں تم سے پوچھ رہی ہوں رجالی؟" وہ چیخ کر بولی۔
"جی وہ تو کل سے ڈیرے پہ ہے۔"
"کب آئے گا؟"
"جی آج تو نہیں آئے گا زمینوں پہ کام ہو رہا ہے۔"
"تو پھر اودے کو گاڑی نکالے۔"
رجالی گدو کو گاڑی نکالنے کا پیغام پہنچانے چلی گئی۔
"ماہی! یہ کیا کر رہی ہو؟" مہرماہ اس کے پیچھے آئی تھی۔
"ڈوبنے سے پہلے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں۔" تمہیں پتے کم نوشتہ رکھتے ہوئے بولی۔
"اسے آزمائش میں مت ڈالو ماہی۔"
"اسے آزمائش میں نہ ڈالا تو میں نہ آر لگوں گی نہ پار۔" اس نے سختی سے جواب دیا۔
"جی ماہی بی بی! گاڑی تیار ہے۔" رجالی واپس آتے ہوئے بولی۔
"چلو میرے ساتھ۔" وہ رجالی کو اشارہ کرتی آگے بڑھ گئی تھی۔
"گاڑی کی اسپیڈ تیز رکھو۔" اس نے اودے کو ہدایت دی ـــــ اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی تھی گاڑی کا رخ ڈیرے کی طرف تھا۔

✿ ✿ ✿

اوائل مارچ کے دن تھے، موسم بہت خوب صورت ہو رہا تھا لیکن وہ بہت بے چین تھا، دل میں کہیں ایک دھڑکا سا تھا کہ وہ نہ جانے کیا کرے گی اتنی آسانی سے تو ہار ماننے والی نہیں ہے۔
لیکن اس نے ایک بار بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مہرماہ اس کے پیچھے ڈیرے تک بھی پہنچ جائے گی ـــــ ان کے بڑے سے وسیع و عریض ڈیرے کے احاطے میں برگد کا بڑا سا درخت لگا ہوا تھا جس کی چھاؤں ڈیرے کے پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی اور اسی چھاؤں کے نیچے داد بخش چارپائی پہ لیٹا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا کہ ڈیرے کے اندر آکر رکنے والی گاڑی کے انجن بند ہونے کی آواز پہ یکدم سر اٹھا کر دیکھا تھا ـــــ
"سردار بیگم کی گاڑی؟" اسے اچنبھا ہوا ـــــ وہ اک جھٹکے سے سیدھا ہو کر اٹھ بیٹھا تھا۔ گاڑی سے رجالی کی شکل نمودار ہوئی تھی اور اس کے بعد مہرماہ نیچے اتری۔
"مہرماہ بی بی ـــــ؟" داد بخش کی آنکھیں پھیل گئیں اس کے کانوں میں خطرے کا الارم بجا تھا۔
"تم لوگ جاؤ مجھے داد بخش سے کچھ بات کرنی ہے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے اودے اور رجالی سمیت وہاں موجود تمام ملازموں کو ڈیرے کے احاطے

سے چلے جانے کا اشارہ کیا تھا۔
"جی بی بی!" وہ لوگ سر جھکا کر باہر نکل گئے۔ مہ پارہ مضبوط قدم اٹھاتی اس کے سامنے آرکی۔
"میں تمہیں لینے آئی ہوں' میرے ساتھ حویلی چلو۔" وہ داد بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی لیکن داد بخش نظر چرا گیا تھا۔
"کیوں؟"
"میرا ہاتھ تھامنے۔"
"میری آپ کے ساتھ شادی نہیں ہو سکتی۔"
"کیوں نہیں ہو سکتی داد بخش؟"
"کیونکہ میں کرنا ہی نہیں چاہتا۔" اس نے صاف صاف کہہ دیا۔
"داد بخش تم کس کو دھوکا دے رہے ہو؟ مجھ کو؟ یا پھر اپنے آپ کو؟" مہ پارہ نے اسے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔
"مہ پارہ بی بی دھوکا تو آپ دے رہی ہیں' وہ بھی صرف اپنے آپ کو۔" اس نے تلخی سے کہا تھا۔
"تم مجھ سے نظریں ملا کر بات کیوں نہیں کرتے۔" وہ اس کا گریبان جھنجوڑ کر بولی۔
"میں گستاخ ہونے سے ڈرتا ہوں۔"
"تم بزدل ہو حقیقت کے سامنے آنے سے ڈرتے ہو۔"
"آپ چلی جائیں بی بی! یکطرفہ سلسلے پائیدار نہیں ہوتے۔" اس نے ضبط کرتے ہوئے رخ موڑا۔ "یک طرفہ؟ میری طرف دیکھ کر کہو داد بخش کہ مہ پارہ علی محمد کے تمام سلسلے یک طرفہ ہیں؟" اس نے اس کے گریبان کو جھٹکا دیا تھا۔ چند لمحے داد بخش چپ رہا پھر اس نے جھکی نظر اٹھائی۔ تین پیالے چھلکنے کو بے تاب تھے۔
"ہاں مہ پارہ بی بی! آپ کے سارے سلسلے یکطرفہ ہیں" "آپ اس سفر میں تنہا ہیں اور تنہائی کا سفر بہت جلد تھکا دیتا ہے۔"
"داد بخش! کیا تمہارے دل میں میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے؟" وہ بے بسی سے بولی۔
"نہیں۔" اس نے مہ پارہ کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا اور مہ پارہ ساکت ہو گئی تھی۔
"داد!" وہ زیر لب پکار کے رہ گئی۔
"معافی چاہتا ہوں مہ پارہ بی بی!" داد بخش نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے اور مہ پارہ اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتی پیچھے ہٹتی چلی گئی تھی۔ داد بخش مزید وہاں نہ رکا اور پلٹ کر دوسری طرف چلا گیا۔
برگد کے درخت پہ بیٹھی کوئل بڑی سریلی آواز میں رو رہی تھی اس کی کوک دور تک جا رہی تھی لیکن مہ پارہ کے دل کی کوک اس کے دل کی دیواروں تک ہی ٹکرا کر رہ گئی تھی۔

وہ نین تیرے' وہ نین میرے
جدوں پیار ہویا بن چار گئے
اے اپنی اپنی قسمت سی!
او جت گئے' وہ ہار گئے

مہ پارہ نے اپنی ہچکیوں کو دباتے ہوئے سر سیٹ کی بیک سے ٹکا دیا تھا لیکن رخساروں پہ بہنے والے آنسو نہیں رکے تھے!

☆ ☆ ☆

رمیز اور مہ پارہ کی منگنی کے فوراً بعد ہی راشدہ بیگم نے شادی کے لیے بھی جلدی مچا دی تھی لیکن سردار بیگم پہلے مہ پارہ کی شادی کرنا چاہتی تھیں' اس لیے انہوں نے کوئی ہامی نہیں بھری تھی لیکن دوسرے ہی روز صابرہ بیگم بھی بیک جنبش حویلی آن پہنچی تھیں۔ وہ بھی اپنی بہو کو رخصت کرانے کی خواہش مند تھیں — اور سردار بیگم کو بھلا کیا چاہیے تھا ایک ساتھ دو شادیوں کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ بھاگ دوڑ زیادہ تر داد بخش ہی کر رہا تھا۔ ہر کام اس کے ذمے تھا فرنیچر والوں کو آرڈر دینے کے بعد انویٹیشن کارڈز کا ڈیزائن پسند کرنے کے لیے حویلی آگیا تھا اور اس کے بعد جیولر کے پاس بھی جانا تھا کپڑوں جوتوں کی خریداری کا کام تو عورتوں کو خود ہی کرنا تھا اس لیے بڑے بڑے اور

بھاری کام داد بخش پہ ڈال دیے تھے اور وہ سب نبٹاتا پھر رہا تھا۔
اس وقت بھی وہ "ویڈنگ شادی کارڈز" لے کر نکل رہا تھا جب اپنے دھیان میں کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔
"داد بخش...؟" وہ اپنے نام پہ ٹھٹکا۔
"شاہ میر...؟" داد بخش بھی اسے پہچان چکا تھا اور پھر دونوں یکدم ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے تھے۔
"تم کب آئے آسٹریلیا سے؟" داد بخش خوشگوار حیرت سے پوچھ رہا تھا۔
"مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً مہینہ ہو گیا ہے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن تم نے شاید نمبر ہی چینج کر لیا تھا؟"
"تم ملک چینج کر سکتے ہو تو کیا ہم نمبر چینج نہیں کر سکتے؟" داد بخش کو آج اپنے بچھڑے دوست سے مل کر بہت خوشی ہو رہی تھی۔
"کر سکتے ہو جناب کر سکتے ہو لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دو کہ اور کیا کچھ چینج کیا ہے۔ ان چار سالوں میں۔" شاہ میر [illegible] تھا۔
"نمبر کے سوا کچھ بھی چینج نہیں۔ یار! اتنی اوقات ہی نہیں تھی۔" داد بخش استہزائیہ ہنسا تھا۔
"بس بس رہنے دے اپنی اوقات مجھ سے پوچھ یا پھر سردار بیگم سے پوچھ۔"
"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے میں خود ہی جانتا ہوں۔"
"لیکن تم شادی کارڈز شاپ میں کیا کر رہے تھے؟ کہیں تم شادی تو نہیں کر رہے؟" شاہ میر نے اندازہ لگایا۔ داد بخش بے ساختہ ہنس دیا تھا۔
"وہ دراصل سردار بیگم کی بیٹی اور دونوں پوتیوں کی شادی ہے' اسی لیے سب کام مجھے ہی کرنا پڑ رہے ہیں۔"
"چلو یار! کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"
"اس وقت جلدی میں ہوں پھر ملیں گے۔" پھر وہ ایک دوسرے سے نمبروں کا تبادلہ کرتے ہوئے رخصت ہوئے تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ اے لیول کیا تھا' وہ یونیورسٹی میں اس کا کلاس فیلو تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ گہری نیند سو رہی تھی جب اس کے موبائل پہ رنگ ہونے لگی چند سیکنڈ تو اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا پھر موبائل کی طرف دھیان گیا۔
"ہیلو؟"
"ہائی! میری جان کیسی ہو؟" دوسری طرف رمیز کی آواز تھی خمار آلود اور بوجھل سی۔
"آپ؟" مہ پارہ کے سوئے ہوئے احساسات بیدار ہو گئے تھے۔
"ہاں میں ہی ہوں رمیز' تمہارے انتظار اور تمہاری طلب میں پاگل' اک اک لمحہ گن کے گزارنے والا۔" رمیز کے اک اک لفظ سے بے تابی اور بے قراری جھلک رہی تھی۔
"آپ کس لہجے میں بات کر رہے ہیں؟" اس کی طرز گفتگو پہ اس کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔
"تمہیں جب جب تنہائیوں میں سوچتا ہوں میرا لہجہ میری آواز ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔"
"پلیز رمیز بھائی! کنٹرول یور سیلف — لیٹ مائنڈ یور لینگویج۔" اس نے دوبارہ سختی سے کہا تھا۔
"یار اب کنٹرول ہی تو نہیں ہو رہا' پتہ نہیں یہ بائیس دن کیسے گزریں گے؟" رمیز پھر بھی باز نہیں آیا تھا۔
"بائیس دن کیسے گزریں گے میں یہ تو نہیں جانتی لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ آپ نے اگر مجھ سے بات کرنی ہے تو بائیس دن بعد فون کیجئے گا۔"
اس نے کہہ کر فون آف کر دیا تھا اور پھر تکیے پہ چہرہ رکھ کے سونے کے لیے لیٹ گئی لیکن دوسری طرف رمیز بھڑک رہا تھا۔ اس نے جب کچھ بھی ذہن میں نہ آیا تو داد بخش کا نمبر ڈائل کر لیا تھا۔
وہ دن بھر کا تھکا ہوا تھا اس لیے آج عشاء کی نماز پڑھنے کے فوراً بعد ہی سو گیا تھا۔ موبائل کے متواتر

بجتے۔ گزشوا کے بیدار ہوا تھا لیکن اسکرین پہ رمیز کا نمبر دیکھ کر چونک گیا۔

"رمیز صاحب کا فون اس وقت؟" اسے اپنے حواس ٹھکانے پہ لاتے ہوئے چند سیکنڈ لگے تھے اور پھر کال اٹینڈ کرلی تھی۔

"دلاور بخش! کہاں ہو تم؟"

"اپنے کمرے میں ہوں رمیز صاحب۔"

"یعنی حویلی میں ہی ہو؟"

"جی ہاں۔"

"میرا ایک کام کرو۔"

"حکم کیجیے رمیز صاحب!" اس نے مؤدب سے لہجے میں کہا۔

"اس فون کو آن رکھو اور اپنی صہلو بی بی کو دے کر آؤ۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" رمیز کا حکم دلاور بخش کے ذہن کو روشن کر گیا تھا اس نے حیرت سے وال کلاک کی سمت دیکھا رات کے ڈھائی بجے کا وقت ہو رہا تھا۔

"اس وقت؟" دلاور بخش نے بے ساختہ کہا۔

"وہ میری منگیتر اور میری ہونے والی بیوی ہے میں اس سے کسی بھی وقت بات کرسکتا ہوں انڈر اسٹینڈ؟"

رمیز کا لہجہ ہتک آمیز تھا وہ چپ ہو گیا۔

"تو تم فون لے کر اس کے پاس جاؤ اس کا اپنا فون تک جا رہا ہے۔" رمیز کے کہنے پہ دلاور بخش کو اسٹریا سلیپر پہن کر باہر نکل آیا اس کا رخ صہلو کے بیڈروم کی طرف تھا سیڑھیاں طے کرتا وہ اس کے کمرے کے سامنے آرکا اور آہستگی سے دستک دی پہلی دستک پہ کوئی رسپانس نہیں ملا تھا لیکن دوسری دستک پہ دروازہ چٹ کھل گیا تھا وہ بکھرے بالوں اور بھیگے سرخ متورم آنکھوں سمیت اس کے سامنے تھی۔

اسے دیکھ کر وہ حیران کھڑی رہ گئی۔

"رمیز صاحب کا فون ہے آپ کے لیے۔" دلاور بخش نے فون آگے بڑھایا اور رمیز کا نام سنتے ہی صہلو کے تن بدن کو آگ سی لگ گئی تھی۔

"اپنے رمیز صاحب سے کہو کہ ابھی آرام کریں اور اطمینان رکھیں ' صہلو علی محمد آپ کی سیج ہی سجائے گی۔" وہ دلاور بخش کو براہ راست دیکھتے ہوئے اتنی اونچی آواز میں بولی کہ رمیز نے بھی بآسانی سنا تھا۔

"اسے کہو ایک بار میرا فون سنے۔" اس نے دلاور بخش سے کہا۔

"وہ ایک بار آپ سے بات کرنا..." ابھی یہ الفاظ دلاور بخش کے منہ میں ہی تھے کہ صہلو نے اس کے ہاتھ سے موبائل چھینا اور پوری قوت سے زمین پہ دے مارا تھا موبائل ٹکڑوں میں بدل گیا تھا اس کے کئی ٹکڑے سیڑھیوں سے نیچے بھی گرے تھے۔

"چلے جاؤ یہاں سے ورنہ تمہارا سر بھی پھاڑ دوں گی۔" وہ یکدم چلائی اور روتے ہوئے دھڑام سے دروازہ بند کرلیا تھا جبکہ دلاور بخش رات کے اس پہر ایسا ہنگامہ دیکھ کر خاموش رہ گیا تھا۔

* * *

"صہلو بیگم...!"

"جی ولاری بیگم؟" صہلو کی شادی کے لیے تیار کروائے جانے والے اپنے کپڑے پھیلا پھیلا کر دیکھ رہی تھی کہ جب سردار بیگم نے پکار لیا۔

"صہلو کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہے۔"

"راشدہ چار پانچ مرتبہ فون کر چکی ہے کہ صہلو کو شہر بھیجیں وہ اپنی پسند سے لہنگا خرید لے گو یہ لڑکی ہر بار ٹال رہی ہے اس سے کہو میری نرمی کا فائدہ نہ اٹھائے نہ جانے کون سے خود ساختہ روگ لگائے پڑی ہے راشدہ اور قدیر کیا سوچتے ہوں گے اس کے بار بار انکار پہ۔"

"آپ پریشان نہ ہوں' میں اس سے کہتی ہوں چلی جائے گی وہ۔" صہلو نے انہیں تسلی دی اور وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

سردار بیگم اندر ہی اندر صہلو کی طرف سے خاصی پریشان بھی تھیں اس لڑکی نے انہیں الجھا کے رکھ دیا تھا۔

* * *

آج شاہ میر نے اسے اپنے گھر بلایا تھا اور اس کے سامنے ایک پرکشش آفر رکھی تھی... دلاور بخش کتنے ہی لمحے حیرانگی کے عالم میں شاہ میر کو دیکھ گیا تھا۔

"کیا بات ہے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟" شاہ میر نے تعجب سے پوچھا۔

"تم یہ آفر کس بنیاد پر دے رہے ہو؟ ہمیں ملے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟"

"کیا مطلب دلاور بخش! ایک دوست ہونے کے ناتے اگر میں تمہیں بزنس میں شمولیت کی آفر کر رہا ہوں تو اس میں کیا بڑی بات ہے؟ پیسہ میں لگاؤں گا کام تم کرو گے بس اتنی سی بات ہے۔" شاہ میر نے کندھے اچکائے۔

"لیکن میرے پاس تو اتنا پیسا نہیں کہ میں کسی بزنس میں شراکت اختیار کروں...؟" دلاور بخش نے حقیقت بتائی۔

"یار میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم پیسہ لگاؤ میں تو بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ تم کام کرو پیسہ میں لگاؤں گا یار کب تک حویلی سے اپنے بچے کا پیٹ پالو گے؟ اپنے بچوں کا کچھ سوچو' شادی ہوگئی تو کیا دو گے انہیں؟ کیا سردار بیگم ہی بوجھ اٹھائیں گی؟" شاہ میر نے اسے فیصلے پہ اکسایا تھا۔

"نہیں شاہ میر! یہ تو میرا بھی اپنے آپ سے عہد ہے کہ جب تک خود کچھ نہ کرلوں' شادی نہیں کروں گا۔" دلاور بخش کا لہجہ مضبوط تھا۔

"تو پھر کرو' دیر کس بات کی ہے؟" اور دلاور بخش سوچنے کا وقت لے کر وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

وہ سردار بیگم کو نہیں چھوڑ سکتا تھا' لیکن ساری زندگی ان پر انحصار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ہاں اگر دونوں کام ایک ساتھ ایڈجسٹ ہو جاتے تو پھر اچھا تھا یوں اپنے کام کرنے کی خواہش بھی پوری کرلیتا اور سردار بیگم کی ذمہ داریاں بھی... اس وقت اس کے ذہن میں کیا کچھ چل رہا تھا' حویلی پہنچا تب بھی سوچ میں گم تھا۔

* * *

"دلاور بخش ادھر آؤ..." ساجدہ بیگم نے اونچی آواز میں پکارا۔

"جی بیگم صاحبہ؟" وہ فوراً قریب آیا تھا۔

"اندر سے گاڑی نکالے میں نے اور صہلو نے شہر جانا ہے۔"

"لیکن وہ تو نہیں ہے اس کو لانڈرنگ والوں کی طرف بھیجا ہے۔"

"او ہم نے تو راشدہ بھابھی کو ٹائم دے رکھا ہے۔" ساجدہ بیگم پریشان ہو گئیں۔

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ دلاور بخش کے ساتھ چلی جاؤ تم دونوں۔" سردار بیگم اندر داخل ہوئیں۔ صہلو صوفے پہ چپ بیٹھی تھی۔

"جاؤ دلاور بخش! گاڑی نکالو۔" انہوں نے پوتی کا سر تھپکتے ہوئے دلاور بخش کو حکم دیا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے دلاور بخش کی نظر بے ساختہ بیک ویو مرر کی طرف اٹھی تھی۔ صہلو کی نظریں جھکی ہوئی تھیں وہ پہلے جب بھی اس کی گاڑی میں بیٹھتی تھی اپنی نظروں کو بیک ویو مرر پہ ہی فوکس کیے رکھتی تھی لیکن آج اس کی نظر کی بے رخی بہت بڑی تبدیلی کا ثبوت تھی۔

* * *

راشدہ بیگم انہی لوگوں کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ راشدہ بیگم کے صرف دو ہی بیٹے تھے رمیز بڑا تھا اور تیمر چھوٹا تھا تیمر اسٹڈی کی غرض سے دوستوں کے ساتھ ہاسٹل میں رہتا تھا جبکہ رمیز اتنے سالوں سے ابھی تک یونیورسٹی سے ہی چپکا ہوا تھا دراصل وہ کافی رنگین مزاج لڑکا تھا رنگوں اور خوشبوؤں میں رہنے والا یونیورسٹی سے نکلنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا اور آئندہ اس کے بزنس وغیرہ کے بھی کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے کیونکہ اسے کام کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اسے بس "کچی پکائی" چاہیے تھی اور راشدہ بیگم اس

کے کرتوتوں سے بہت ناراض بھی رہتی تھیں اور فکرمند بھی۔۔۔! لیکن اس نے مہ پارہ کو پسندیدگی کی سند بخش کر راشدہ بیگم کی سوچوں کو ایک نیا رخ دے دیا تھا۔

مہ پارہ بیاہ کر دوسری حویلی جانے والی تھی۔ منزہ اور وارث کافی چھوٹے تھے اور رہی مہ پارہ تو وہ اس کی بیوی بن کے ہمیشہ کے لیے اس کی دسترس میں آجاتی۔ اس طرح وہ حویلی کا سرپرست بھی بن سکتا تھا کیونکہ حویلی میں ایک اس کی تائی بیگم تھیں اور ایک پھوپھی بیگم وہ کون سا اس پہ کوئی روک ٹوک کر سکتی تھیں؟ دونوں اس کی اپنی اور سگی تھیں انہیں رمیز سے زیادہ عزیز بھلا کون ہو سکتا تھا؟ رمیز بیٹھے بیٹھے جاگیر کا مالک بن جاتا۔

آج مہ پارہ ہونے والی بہو کے ناتے ان کے گھر پہلی بار آئی تھی۔ راشدہ بیگم اس کے واری صدقے جا رہی تھیں۔

"قدیر بھائی کہاں ہیں؟" ماجدہ بیگم صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"وہ اسلام آباد گئے ہیں کسی کام سے 'کل آجائیں گے۔"

"تم سناؤ میری جان کیسی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ اتنی ست کیوں ہو رہی ہو؟" راشدہ بیگم نے مہ پارہ کو بازو کے حلقے میں لے کر اپنے کندھے سے لگایا تھا۔

"شادی کے دنوں میں ہر لڑکی ایسی ہی ہو جاتی ہے۔" ماجدہ بیگم نے مسکرا کر مہ پارہ کو دیکھا تھا۔ آج کل وہ بھی بڑی خوش نظر آتی تھیں کہ چلو اس حویلی اور جاگیر پہ میرے بھتیجے کا کوئی حصہ ہوئی گیا۔۔۔!

"مارکیٹ کب چلنا ہے؟" ماجدہ بیگم نے ناشتے کھا تے ہوئے کہا۔

"وہ میں نے جس بوتیک سے مہ پارہ کا لہنگا تیار کروانا ہے اس کی ڈیزائنر تو چار بجے آتی ہے۔"

"ارے وہ داد بخش کہاں ہے؟" راشدہ بیگم نے یاد آنے پہ پوچھا۔

"باہر گاڑی میں ہوگا۔"

"ارے نہیں وہ باہر کیوں ہے بلائیں اس کو یہاں بیگم کو پتا چلا تو مجھے باتیں سنائیں گی۔" راشدہ بیگم خود ہی اسے بلانے کے لیے کھڑی ہو گئی تھیں۔

"رہنے دو 'اب ہمارے درمیان کہاں گھس کے بیٹھے گا؟ اماں بیگم نے تو اپنے ہر ملازم کو سر چڑھا رکھا ہے اور یہ تو بن کا چہیتا ہے آخر۔۔۔!" ماجدہ بیگم ناگواری سے بولیں۔ مہ پارہ نے اتنے عرصے میں پہلی بار آنکھیں اٹھا کر ماجدہ بیگم کو دیکھا تھا اس کی نظروں میں کاٹ تھی لیکن اپنی بیزاری اور کوفت کے اظہار میں مگن ماجدہ بیگم اس کی نظروں کی کاٹ محسوس نہیں کر سکی تھیں۔۔۔!

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن اماں بیگم کی وجہ سے بروقت نبھانا پڑتی ہے۔"

راشدہ بیگم کہہ کر باہر چلی گئیں لیکن وہاں جا کر پتا چلا کہ داد بخش ان کے چوکیدار کے کوارٹر میں نماز پڑھنے گیا ہے۔ سو چپ چاپ واپس لوٹ آئیں۔

"وہ عصر کی نماز ادا کر رہا ہے شاید سفر کے دوران قضا ہو گئی تھی۔" ان کا لہجہ دھیما تھا۔ جبکہ ماجدہ بیگم پہلو بدل کر رہ گئیں۔ "ہونہہ! بڑا نیک 'اور باکردار بنتا ہے۔" انہوں نے اس کی عبادت پہ طنز کرنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔

راشدہ بیگم مہ پارہ کے لیے کچھ کھانے کو منگوا رہی تھیں کہ بوتیک سے کال آگئی۔۔۔ اور پھر ان لوگوں کو جلدی گھر سے نکلنا پڑ گیا تھا۔ وہ بھی نماز پڑھ کے آچکا تھا فورا" ہی وہ لوگ بوتیک کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

وہ لوگ بوتیک کے سامنے اتریں تو مہ پارہ 'داد بخش کے پاس ٹھہر گئی۔

"تم بھی ساتھ آجاؤ 'میرے دل کا بوجھ تو نہیں اٹھا سکے 'دل کی جگہ کا بوجھ ہی اٹھا لینا 'میرا مطلب ہے کہ شاپنگ بیگ ہی اٹھا لینا 'ہیلپ ہو جائے گی۔" اس نے ایک ایک لفظ جل کر منہ سے ادا کیا تھا اور داد بخش اس کے ایسے زہر میں بجھے لفظوں پہ من سا کھڑا رہ گیا تھا۔

وہ وہیں کھڑا سوچ رہا تھا جب شاہ میر کی کال آگئی شاہ میر اپنا کاروبار سیٹ کرنے میں لگا ہوا تھا اور داد بخش کے شادیوں سے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ شاہ میر سے بات کرتے ہوئے بوتیک سے باہر سیڑھیوں پہ آ کھڑا ہوا تھا لیکن شاہ میر اس کی جانب جاتی فورا" لوٹ کر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا جب وہ لوگ شاپنگ سے فارغ ہوئے تھے اور واپس راشدہ بیگم کے گھر آتے ہوئے انہیں بارہ بج گئے تھے سردار بیگم شام سے اب تک انہیں کئی بار فون کر کے پوچھ چکی تھیں۔

"اماں بیگم کیا بات ہے؟ آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں کیا ماجدہ بھابھی اور مہ پارہ کسی غیر کے گھر آئی ہوئی ہیں؟" راشدہ بیگم نے تھک کر صوفے پہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"فکر کی بات نہیں ہے راشدہ! دراصل مہ پارہ ہماری کی دلہن ہے کل شام اس نے مایوں بیٹھنا ہے اور وہ گھر سے باہر گھوم رہی ہے۔ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا جب شادی کی تاریخ طے ہو جاتی ہے تو دلہن گھر سے باہر نہیں نکلتی بدشگونی ہوتی ہے 'یہ تو میں نے تمہاری اور قدیر کی ضد کی وجہ سے بھیج دیا۔"

"ارے نہیں اماں بیگم! اب بدشگونی نہیں ہوتی۔ وہ زمانے اور تھے ایسے وہم پالنے والے 'آپ بے فکر رہیں مہ پارہ اپنے گھر میں ہے چند دن بعد بھی تو اس نے اسی گھر میں آنا ہے نا؟"

"خیر چھوڑو۔۔۔ واپس کب آ رہی ہیں؟"

"آج وہ واپس نہیں آئیں گی بارہ بجے کا ٹائم ہو رہا ہے اور ابھی مہ پارہ کے لہنگے سے میچنگ زیور بھی لینا ہے۔ یہ اپنی جیولری پسند کر کے ہی جائے گی۔"

راشدہ بیگم کی بات پہ سردار بیگم کو پریشانی لاحق ہوئی۔ "لیکن راشدہ۔۔۔؟"

"اماں بیگم کیا آپ کو ہم پہ اتنا بھی اعتبار نہیں؟" راشدہ بیگم نے افسوس کا اظہار کیا تو سردار بیگم چپ ہو گئیں۔

"داد بخش کو واپس بھیج دوں؟"

"نہیں نہیں داد بخش بھی وہیں رہے گا۔ اس کے لیے بیڈ روم کھلواؤ 'کافی تھک چکا ہو گا۔" انہوں نے فورا" روک دیا تھا۔

"او کے میں اس کے سونے کا انتظام کروا دیتی ہوں 'اب آپ بھی سو جائیے۔" راشدہ بیگم نے فون بند کر دیا تھا۔

پھر ملازمہ سے کہہ کر انہوں نے ماجدہ بیگم اور مہ پارہ کے لیے بیڈ روم کھلوائے تھے۔ داد بخش کے لیے تو گیسٹ روم کھولا تھا۔ مہ پارہ کافی تھکی ہوئی اور بیزار ہو رہی تھی وہ فورا" ہی سونے کے لیے چلی گئی۔ وہ دونوں خواتین باتیں کرتی رہیں۔

رات کے ایک بجے قدیر بھائی کی اسلام آباد سے واپسی ہوئی تو ان کو آتے ہی خیال آیا تھا۔ قدیر بھائی اپنی بہن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے لیکن باتیں کرنے کا ارادہ کل تک ملتوی کر کے بیڈ روم میں چلے گئے لیکن راشدہ بیگم پھر بھی بیڈ روم میں نہیں گئیں وہ اکیلی لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

انہیں رمیز کا انتظار تھا بلکہ اس کا کسی سے سامنا نہ ہو کیونکہ انہیں یقین تھا کہ اگر وہ اس وقت گھر چلا آیا تو اسے خواسوں میں ہی ادھ کا اور راشدہ بیگم کے خدشے کے عین مطابق وہ جب گھر میں داخل ہوا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اس کے دوست اسے گیٹ تک چھوڑ کے گئے تھے۔

"آپ۔۔۔ جاگ رہی ہیں؟" رمیز کو انہیں اکیلے بیٹھے دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں تمہارے انتظار میں۔۔۔!"

"واؤ میرے 'میرے انتظار میں مگر کیوں؟" رمیز سیڑھیوں کی ریلنگ تھام کے بمشکل کھڑا تھا۔

"کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں اس حالت میں شادی سے پہلے حویلی کا کوئی بھی فرد دیکھے۔" وہ غصہ دباتے ہوئے بولیں۔

"حویلی۔۔۔ کا فرد؟ یہاں کیسے؟" اسے حیرانی ہوئی۔

"ماجدہ بھابھی 'مہ پارہ اور داد بخش یہاں ہی ہیں شاپنگ کرتے ہوئے لیٹ ہو گئے تھے اس لیے میں نے

انہیں یہیں روک لیا ہے آپ سیدھے اپنے بیڈ روم میں جاؤ اور صبح اپنا حلیہ درست کر کے سامنے آنا۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں لیکن رمیز کا نشے میں ڈوبا ہوا ذہن ایک ہی لفظ پہ اٹکا رہ گیا تھا — صہبا!

"اب کھڑے کیوں ہو؟ جاؤ اپنے بیڈ روم میں۔" وہ پلٹ کر دبے لہجے میں دوبارہ اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"جاتا ہوں ڈیئر ماما۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہتا اوپر آگیا اور اپنے بیڈ روم میں آکر اس نے پہلا کام یہی کیا کہ اپنی شرٹ اتار کر پھینکی اور صوفے پہ گر کر سگریٹ پینے لگا لیکن لگاتار دو تین سگریٹ پینے کے باوجود اس کا ذہن اس نام کی گرفت سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ وہ بالآخر اٹھ کر بیٹھ گیا اور جارحانہ تیوروں سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس نے باری باری بیڈ روم چیک کیے ہاجرہ بیگم جس بیڈ روم میں تھیں اس کا لاک اوپن تھا لیکن جس بیڈ روم میں صہبا سو رہی تھی وہ اندر سے لاک تھا۔

"ابھی کھول لیتا ہوں۔" اس پر شیطانیت سوار ہو چکی تھی۔ وہ سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے کچن میں آیا تھا وہ کچن کا وہ کیبنٹ کھولا جہاں راشدہ بیگم گھر کے کمروں کی چابیاں رکھتی تھیں۔ چابیوں کا گچھا اٹھا کر اسے صہبا کے بیڈ روم میں آنے میں بس پانچ منٹ لگے تھے اس نے بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے دروازے کا لاک کھولا اور ہینڈل گھما کر اندر آگیا اور اندر داخل ہو کر دروازہ لاک کر دیا مگر وہ اپنی فتح کے عالم میں یہ بھول گیا کہ وہ چابیوں کا گچھا باہر دروازے کے لاک میں ہی جھولتا ہوا چھوڑ گیا ہے۔

صہبا جس بیڈ روم میں سو رہی تھی اس کا لیمپ خراب تھا اس لیے اسے ایک انرجی سیور جلا کر سونا پڑا تھا اور اس انرجی سیور کی روشنی میں رمیز کی گہری نظریں اس پہ جم گئی تھیں اس کی ہونے والی بیوی اس کو دھتکار کر بات کرنے والی حسینہ آج اس کے سامنے تھی۔

✿ ✿ ✿

یہ اس کے لیے نئی جگہ تھی اس لیے اسے کوشش کے باوجود نیند نہیں آرہی تھی وہ نجانے کتنی بار کروٹیں بدل چکا تھا اس گیسٹ روم میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی کہ وہ اپنا ٹائم ہی پاس کر لیتا اور نہ ہی وہ اٹھ کر باہر جا سکتا تھا کیونکہ وہ یہاں مہمان تھا اور کسی کے گھر میں یوں رات کے وقت اٹھ کر گشت کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ حویلی میں ہوتا تو اور بات تھی اسی لیے وہ زبردستی آنکھیں بند کیے لیٹا رہا لیکن جیسے ہی اس کے موبائل پہ رنگ ہوئی وہ چونک گیا تھا کیونکہ کال سردار بیگم کی تھی۔

"السلام علیکم!" اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کال ریسیو کی۔

"کیا بات ہے تم جاگ رہے تھے؟" انہیں اتنی جلدی کال ریسیو ہونے پہ حیرت ہوئی تھی۔

"جی وہ دراصل نئی اور اجنبی جگہ ہے اس لیے نیند نہیں آرہی۔" اس نے وضاحت کی۔

"تو تم رمیز کے پاس بیٹھ جاتے تھوڑی دیر کے لیے؟"

"رمیز صاحب گھر پہ نہیں تھے ابھی تھوڑی دیر پہلے آئے ہیں اور اس وقت میں ان کے پاس کیا بیٹھتا؟" اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"کیوں رمیز کہاں گیا ہوا تھا؟"

"شاید اپنے دوستوں کے ساتھ گئے تھے۔"

"صہبا اور ہاجرہ سو گئی ہیں؟"

"جی وہ تو سو گئی ہیں لیکن آپ کیوں جاگ رہی ہیں اس وقت؟"

"بس میرا بچہ میرا دل یونہی لیٹے لیٹے گھبرانے لگا تو میں اٹھ کر بیٹھ گئی" آج ولی محمد اور اس کے باپ کی بہت یاد آرہی تھی۔ آج وارث کی ماں گھر پہ نہیں تھی اسی لیے وہ میرے پاس سونے کے لیے آگیا اور اس کی صورت دیکھ دیکھ کر ولی محمد کی شکل آنکھوں میں گھومنے لگی ہے۔ دل پہ اداسی چھا گئی ہے۔" سردار بیگم کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"سردار بیگم! اتنی اداسی اور مایوسی وہ [illegible] آپ میں؟" داد بخش نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"داد! میرے بچے میں بھی انسان ہوں بوڑھی ہو چکی ہوں مگر اپنے بچوں کے لیے خون کو دل میں رکھتی ہوں میں کب تک جیا کروں گی؟ اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ میری پوتیوں کو آباد کرے اور مجھے جیتے جی ان کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔" انہوں نے بھیگے لہجے میں کہتے ہوئے گویا دعا کی تھی۔

"ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا اور اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پہ سلامت رکھے۔" وہ بھی دل کی گہرائیوں سے بولا تھا۔

"داد! تم مجھے بتاؤ صہبا نے اب تو تم سے کوئی بات نہیں کی؟" سردار بیگم کی سوئی صہبا پہ اٹکی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ انہیں جواب دیتا کسی کی چیخوں کی آواز۔ داد بخش بری طرح چونک گیا تھا۔

"داد بخش! تم چپ کیوں ہو گئے؟"

"وہ باہر کسی کے چیخنے کی آواز آرہی ہے باہر شور سا ہے۔" وہ عجلت سے کہتا جوتے پہن کر باہر نکلا تھا۔

"کیسا شور ہے؟" سردار بیگم کے دل پہ ہاتھ پڑا۔

"صہبا بی بی کی آواز ہے میں دیکھتا ہوں۔" داد بخش موبائل بند کر کے جیب میں ڈالتا سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

صہبا دروازہ پیٹ رہی تھی اور ساتھ ہی چیخ رہی تھی۔

"بچاؤ ۔۔۔" وہ بلند آواز سے پکاری۔

"تمہیں کوئی بھی نہیں بچائے گا اس وقت سب نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں۔" رمیز کی خباثت زدہ آواز پہ داد بخش کے قدم تیز ہو گئے تھے اس نے جاتے ہی دروازے کو ٹھوکر ماری تھی لیکن دروازہ لاک تھا۔

"صہبا بی بی!" داد بخش نے اونچی آواز میں پکارتے ہوئے اپنی طرف سے اسے تسلی دی تھی۔

"داد دروازہ کھولو داد!" وہ ماہی بے آب کی مانند تڑپی اور داد کی نظر چابیوں کے گچھے کی طرف گئی تھی جو ۔۔۔ ہی داد کی بیسل نکل دی تھی۔ اس نے چابی گھمائی اور دروازہ دھڑام سے کھول دیا سامنے صہبا کے منہ پہ رمیز کا ہاتھ جما ہوا تھا وہ اس کی آواز کا گلا گھونٹ دینا چاہتا تھا اور داد بخش کا صہبا کو بغیر دوپٹے کے اس حال میں دیکھ کر خون کھول اٹھا تھا اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چھوٹتے ہی اپنے فولادی ہاتھ کا مکا رمیز کے منہ پہ رسید کیا تھا۔ رمیز کو داد بخش سے اس حرکت کی توقع نہیں تھی جبھی اچانک حملے سے بچ نہ سکا اور پیچھے کی طرف دیوار کے ساتھ جا لگا۔ ساتھ ہی منہ سے کراہ نکلی تھی۔

"داد بخش! یہ کیا کر رہے ہو؟" ہاجرہ بیگم قدرے ہڑبڑائی اور راشدہ بیگم بھی ننگے پیر بھاگتے ہوئے اوپر آئے تھے لیکن اوپر صہبا کے بیڈ روم کی صورت حال دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں صہبا کی قمیص بازوؤں سے پھٹی ہوئی تھی دوپٹہ نیچے قالین پہ مجروح حالت میں پڑا تھا اس کے بال بکھرے ہوئے اور چہرا تھپڑوں کے نشان سے سرخ پڑ رہا تھا۔ ہاجرہ بیگم کی ٹانگیں لرزنے لگی تھیں۔

"اس ذلیل کو سزا دے رہا ہوں اس کا خون پی جاؤں گا میں ۔۔۔ اس نے سردار بیگم کی عزت پہ ہاتھ ڈالا ہے میں اس کے ہاتھ کاٹ دوں گا۔"

داد بخش کی آنکھوں سے ہی نہیں منہ سے بھی شعلے نکل رہے تھے۔

"بس کرو کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" راشدہ بیگم بیٹے کی درگت نہیں دیکھ سکی تھیں۔

"آپ دیکھ نہیں رہیں کیا ہو رہا ہے؟" داد بخش یکدم دھاڑا۔

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟" راشدہ بیگم غصے سے بولیں۔

"میں اسی لہجے میں بات کر رہا ہوں جس لہجے کو آپ ٹھیک طرح سے سمجھ سکیں گی۔" داد بخش نے پلٹ کر زمین پہ گرا دوپٹہ اٹھایا اور صہبا کے گرد خود ہی لپیٹ دیا تھا۔ اس وقت یہ کوئی اور ہی داد بخش نظر آرہا تھا بے خوف، نڈر اور غصیلا۔

ایک لمحے کے لیے تو رو آبی جلتی صباء نے بھی حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے اماں! میں اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے جا رہا تھا کہ مجھے صباء کے کمرے سے باتوں کی آواز آئی اور میں اس طرف آ گیا دروازہ اندر سے لاک تھا اسی لیے میں کچن سے چابیاں لے آیا اور۔۔۔ اور جب دروازہ کھولا تو یہ دونوں۔۔۔ یہ دونوں اپنی ہی رنگ رلیوں میں گم نظر آئے۔۔۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنا الزام میرے سر ڈال دیا اور اس نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔"

رمیز نے مکاری کی حد کر ڈالی تھی جس پہ داور بخش اور صباء اپنی جگہ بے دم ہو گئے تھے جبکہ راشدہ بیگم کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ انہیں بیٹے کا پلان سمجھ میں آ گیا تھا کہ اب بچنے کا یہی طریقہ تھا!

"سنا ہاجرہ بھابھی؟ سنا آپ نے یہ کیا گل چھرے اڑا رہے تھے؟ یہ ہو رہا تھا یہاں؟" راشدہ بیگم نے بلند آواز میں کہتے ہوئے اپنے سینے پر دو ہتڑ مارا تھا لیکن ہاجرہ بیگم بے حس و ساکت کھڑی نظر آ رہی تھیں ان کا دل رمیز کی جھوٹی کہانی پہ ایمان نہیں لایا تھا۔ وہ بے شک داور بخش سے خار کھائے رہتی تھیں لیکن داور بخش کے کردار پہ انہیں رتی برابر بھی شک نہیں تھا۔

"پھپھو۔۔۔؟" صباء کی آواز جیسے کنوئیں سے سنائی دی تھی۔

"مر گئی پھپھو! تم نے حویلی کے نوکر کے ساتھ منہ کالا کر کے ہماری عزت کا جنازہ نکال دیا ہے اگر اتنا ہی پسند تھا یا اتنی ہی عشق و عاشقی کی تھی تو میرے بیٹے پہ ڈورے ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟ پہلے ہی بتا دیتیں اور یہ۔۔۔ یہ ہماری حویلی میں اسی لیے آیا تھا ہماری ہی عزت میں نقب لگانے کے لیے۔" راشدہ بیگم کا واویلا شروع ہو چکا تھا۔

"راشدہ! یہ کیا کیے جا رہی ہو؟ آرام سے بیٹھ کر ساری بات سمجھاؤ۔" قدیر ہمدانی نے پہلی بار مداخلت کی تھی۔

"سمجھانے کو رہ ہی کیا گیا ہے؟ میں ابھی فون کرتی ہوں اماں بیگم کو۔" راشدہ بیگم نیا تیر کھینچنے کے لیے تیار ہو چکی تھیں۔

"راشدہ بھابھی! اس وقت اماں بیگم کو کچھ مت بتائیں۔" ہاجرہ بیگم نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

"کیوں نہ بتاؤں؟ انہوں نے ایک عمر ہو گئی یہ سانپ لا کر ہمارے سینے پہ بٹھا رکھا ہے آج اس سانپ نے ڈس ہی لیا نا!"

راشدہ بیگم، داور بخش پہ قہر آلود نظر ڈالتے ہوئے بولیں، وہ چپ کھڑا تھا۔ لیکن اس دوران ہی اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا تھا کال کرنے والی سردار بیگم ہی تھیں۔ راشدہ بیگم کو پتہ چل گیا تھا تب ہی داور بخش کے ہاتھ سے فون جھپٹ کر کان سے لگا لیا تھا۔

"اماں بیگم! کہاں ہیں آپ؟ آئیے اور اپنے چہیتے کے کرتوت دیکھیے ہماری عزت پہ ہاتھ ڈالا ہے اس نے نمک حرام نکلا ہے آپ کا پالا ہوا۔۔۔"

"کس کی بات کر رہی ہو؟" سردار بیگم کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"آپ کے داور بخش کی۔۔۔" اس کی طرف دیکھتے ہوئے راشدہ بیگم نے چبا چبا کر کہا تھا اور دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تھا۔

داور بخش نے ان سب پہ اک طائرانہ سی نظر ڈالی اور رمیز کو غضب ناک نظروں سے دیکھتا ہوا۔ صباء کا ہاتھ پکڑ کر ان سب کے درمیان سے نکلتا چلا گیا تھا اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر گاڑی سے اپنی چادر نکال لایا اور چادر صباء کو اوڑھا دی۔

"آپ چپ ہو جائیں، کچھ نہیں ہو گا، سردار بیگم بس پہنچنے والی ہوں گی۔"

داور بخش نے ڈرائنگ روم میں ٹہلتے ہوئے وال کلاک دیکھا۔

"لیکن انہیں تو ابھی پتا چلا ہے۔"

"نہیں انہیں بھی اسی وقت پتہ چل گیا تھا جس وقت مجھے پتہ چلا تھا۔" داور بخش کی بات پہ صباء کچھ نہ سمجھی لیکن مزید کچھ بولی بھی نہیں تھی۔۔۔ وقت تھا کہ گزر ہی نہیں رہا تھا سوئیاں ایک ہی جگہ پہ جمی تھیں۔

☆ ☆

باہر گاڑی کے ہارن کی آواز سنتے ہی جہاں راشدہ اور رمیز اپنے اپنے محاذوں پہ الرٹ ہوئے تھے۔ داور بخش کی پریشانی قدرے کم ہو گئی تھی لیکن صباء ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھی تھی وہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی تھی اور گاڑی سے اترتی سردار بیگم سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ان کے پیچھے قاسم علی کی گاڑی تھی اور قاسم علی کے ساتھ ساجدہ بیگم بھی تھیں۔

"صباء! کیا ہوا ہے بیٹا؟ کچھ بتاؤ تو؟" راجہ ہمدانی نے آگے بڑھ کے صباء کو سردار بیگم سے الگ کرنا چاہا۔

"داری بیگم! اور رمیز۔۔۔ رمیز نے۔۔۔" اس کی آواز حلق میں ہی دب گئی تھی قاسم علی بھی مٹھیاں بھینچ کے رہ گیا تھا۔

"بس! اندر بیٹھ کر بات کرو۔" اس نے صباء کو کندھوں سے تھاما اور اندر لے آیا تو باقی سب بھی اندر آ گئے۔

"اماں بیگم! دیکھا آپ نے؟ کیا گل کھلائے ہیں آپ کے۔۔۔"

"بس راشدہ بس، بند کرو اپنی زبان، پہلے مجھے صباء سے پوری بات سن لینے دو۔" انہوں نے سختی سے کہتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا تھا۔

"یہ آپ کو کیا بتائے گی؟ کبھی چور نے بھی اپنی چوری بتائی ہے بھلا؟" وہ طنزیہ بولیں۔

"چور اپنی چوری نہیں بتاتا لیکن واویلا بہت کرتا ہے جو اس وقت صرف تم کر رہی ہو۔" سردار بیگم بھی ان ہی کی ماں تھیں۔

"اماں بیگم! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ کو میری بات پہ یقین نہیں اور اس دو ٹکے کے نوکر پہ یقین ہے؟" راشدہ بیگم کے انداز میں حقارت اتر آئی تھی۔

"دو ٹکے کا نہیں دو ٹکے کا تمہارا بیٹا ہے۔"

سردار بیگم نے کسی کا بھی لحاظ رکھے بغیر انہیں آئینہ دکھایا تھا جس پہ وہ سب ہی نے چونک کر سردار بیگم کو دیکھا تھا ان کے انداز میں کوئی لچک نہیں تھی لیکن اس بات پہ راشدہ بیگم کو پتنگے لگ گئے تھے۔

"آپ میرے بیٹے کو دو ٹکے کا کہہ رہی ہیں؟ اس گھٹیا، لاوارث کے لیے آپ میرے بیٹے۔۔۔ انگلی اٹھا رہی ہیں؟ اس کی اوقات ہی کیا ہے؟ جس کو اس کے اپنوں نے کتے کی طرح دھتکار کر پھینک دیا تھا اور آپ اسے اٹھا کر گھر لے آئیں؟ میرے باپ اور بھائیوں کے ٹکڑوں پہ پلنے والے کو آپ میرے برابر، میرے مقابل کھڑا کر رہی ہیں؟ اس نمک حرام کی خاطر آپ مجھے۔۔۔"

"چٹاخ۔۔۔" سردار بیگم کے بوڑھے ہاتھ میں بھی اس قدر طاقت آ سمائی تھی کہ راشدہ بیگم کو دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔

"اماں بیگم۔۔۔!" ساجدہ نے لپک کے سردار بیگم کا بازو تھام لیا تھا۔

"پیچھے ہٹو ساجدہ! مجھے آج بتانے دو کہ داور بخش کی اوقات کیا ہے؟" انہوں نے ساجدہ کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ "داور بخش جیسا کردار تمہاری آنے والی سات نسلوں میں بھی کسی کا نصیب ہو گا۔ اس کا چلن کیسا ہے یہ صرف میں جانتی ہوں صرف میں۔۔۔ یہ صرف داور بخش ہی تھا جو مجھے آ کر یہ بھی بتا رہا تھا کہ سردار بیگم آپ کی پوتی بدلحاظی کر رہی ہے، اسے روکیے، اسے سمجھائیے نادان ہے اوقات کا فرق نہیں سمجھتی۔"

صباء نے تڑپ کر حیرت زدہ سے انداز میں داور بخش کو دیکھا یعنی اس نے سردار بیگم کو پہلے ہی سب کچھ بتا رکھا تھا۔۔۔؟

"اور تم یقین کی بات کرتی ہو؟ مجھے اس پہ اور اس کے کردار پہ تو یقین ہے لیکن تمہارے کردار پہ نہیں ہے۔۔۔ تم اس وقت اپنے بیٹے کے بجائے صباء اور داور بخش کا ساتھ دیتیں تو شاید مجھے تم پہ بھی یقین آ ہی جاتا۔"

"آپ یہ کس بنیاد پہ کہہ سکتی ہیں کہ داور بخش بے قصور ہے؟" راشدہ چنگھاڑ کے بولیں۔

"قاسم علی نے دیکھا تو اسے میرا فون، جس وقت

تمہارے بیٹے نے میری پوتی' میری عزت پہ ہاتھ ڈالا میں اس وقت داد بخش کے ساتھ فون پہ بات کر رہی تھی۔"

انہوں نے ایک اور انکشاف کیا تھا۔ راشدہ بیگم کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ قدیر ہمدانی' رمیز اور ماجدہ بیگم بھی چونک گئے تھے یہاں تک کہ مہ پارہ نے بھی حیرت اور بے یقینی سے دیکھا تھا۔

تمہارے بیٹے کے گھٹیا کرتوت کا مجھے پتا کیسے ہی پتا چل گیا تھا اسی لیے قاسم علی اور عابدہ کو فون کرکے حویلی سے نکل آئی' شکر ادا کرتی ہوں اپنے رب کا' جس نے میری بچی کو برباد ہونے سے بچا لیا' شادی کے بعد اصلیت سامنے آتی تو میں کیا منہ دکھاتی؟" انہوں نے انتہائی نفرت و حقارت سے کہتے ہوئے رمیز کو دیکھا تھا۔

"امی بیگم۔۔۔!"

"خبردار اپنی گندی زبان سے مجھے اماں مت کہنا۔" انہوں نے انگلی اٹھا کر روک دیا تھا۔

"زیور کہاں ہے ماجدہ؟" ان کے اگلے سوال پہ وہ سب ایک بار پھر چونک گئے تھے۔

"وہ۔۔۔ وہ مہ پارہ کے کمرے میں رکھا تھا شاید۔" ماجدہ بیگم گھبرا گئیں۔

"جاؤ لے کر آؤ۔" ان کے حکم پہ ماجدہ بیگم فوراً لے آئی تھیں۔

"کتنے کا آیا تھا؟"

"جی جی۔۔۔ پچاس ہزار کا۔۔۔" ماجدہ بیگم نے بوکھلاہٹ میں جواب دیا۔

"رجب علی! پرس سے پچاس ہزار نکال کر میرے ہاتھ پہ رکھو۔" انہوں نے سب سے پیچھے کھڑے رجب علی کو حکم جاری کیا۔۔۔ اور قلت میں رجب علی نے پانچ پانچ ہزار کے دس نوٹ نکال کر ان کے ہاتھ پہ رکھ دیے۔

"یہ میری بچی کے پہلے شگن کا جوڑا ہے' سہاگ کا جوڑا اس لیے اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی' وہ اپنی شادی کے دن یہی پہنے گی۔"

انہوں نے پچاس ہزار راشدہ بیگم کے منہ پہ دے مارے تھے۔

"شادی؟" ایک بار پھر سب چونک گئے تھے۔

"ہاں! شادی اس کے ساتھ شادی جو اس کا شوہر بننے کا حق رکھتا ہے' جو بد چلن اور بد کردار نہیں ہے اور یہ نیچی نظر اور اونچے ایمان والا اور کون ہو سکتا ہے سوائے میرے داد بخش کے؟"

سردار بیگم نے فخر سے سر بلند کرتے ہوئے داد بخش کی طرف دیکھ کر دھماکا کیا تھا۔ وہاں موجود تمام نفوس بم بخود کھڑے رہ گئے تھے۔ داد بخش ششدر سا ان کو دیکھ رہا تھا۔۔۔!

٭ ٭ ٭

فجر کی اذان ہو رہی تھی جب وہ لوگ واپس حویلی پہنچے تھے وہ سب اندر کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن داد بخش باہر ہی رک گیا تھا۔

"تم کیوں رک گئے؟" قاسم علی نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔"

"واپسی پہ مولوی صاحب کو اپنے ساتھ ہی لے آنا۔" سردار بیگم نے پلٹ کر ہدایت دی۔

"سردار بیگم؟" اس نے بے بسی سے انہیں دیکھا تھا۔

"قاسم علی! جاؤ اس کے ساتھ' آج تم بھی ثواب کماؤ' فجر کی نماز پڑھو اور واپسی پہ اس کے ساتھ ہی مولوی صاحب کو بھی لے آنا' صبح کا سورج نکلنے سے پہلے ہی نکاح ہو جائے تو بہتر ہے' رخصتی مہ پارہ کے ساتھ ہی ہو گی۔" سردار بیگم کے حکم سے انکار بھی کب تھا؟ قاسم علی داد بخش کے ساتھ ہی مسجد چلا گیا تھا۔۔۔!

اور جب وہ دونوں نماز پڑھ کے مولوی صاحب کو ساتھ لے کر حویلی آئے تو وہاں دوسری حویلی کے بھی تمام افراد آئے ہوئے تھے۔ اور یقیناً ان کو سردار بیگم نے ہی بلایا تھا۔

"مولوی صاحب پہلے قاسم علی اور مہ پارہ کا نکاح

بھی مہ پارہ ہی بیٹی ہے پہلے اسی کا نکاح ہو گا۔"

لیکن قاسم علی کے نکاح کے بعد جب داد بخش کی باری آئی تو وہ سر کیا لرز اٹھا تھا۔ اسے لگا سردار بیگم نے زمین سے اٹھا کر عرش پہ بٹھا دیا ہے۔

"داد بخش سمجھو کہ تمہاری دعا بھی قبول ہو گئی ہے' ویسے بھی تم نے تو نمازیں بھی بہت پڑھی ہیں اور دعائیں بھی بہت مانگی ہیں۔" قاسم علی نے داد بخش کو کہنی مارتے ہوئے چھیڑا تھا۔

اور پھر سب کی موجودگی میں سردار بیگم نے اپنی پوتی داد بخش کی زوجیت میں دے دی تھی۔ انہوں نے اپنی عزت اسے سونپ ڈالی تھی۔ ہر طرف مبارک سلامت کا شور مچ گیا تھا لیکن داد بخش سردار بیگم کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

"سردار بیگم! میں آپ کا نوکر' آپ کا خادم اس قابل نہیں تھا' میں آپ کے قدموں کی خاک بھی نہیں تھا آپ نے مجھے عرش پہ بٹھا دیا ہے۔" اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

سردار بیگم نے اسے کندھوں سے تھام کے اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔۔۔ "میرے بچے تم نہیں سمجھے کیا ہے آج تم نہ ہوتے تو اس حویلی کی عزت نہ جانے کہاں ڈوب جاتی۔ اللہ تمہیں زندگی سے خوش رکھے' آباد رکھے۔" انہوں نے داد بخش کی پیشانی چوم کر اس کے کندھے پہ ہاتھ پھیرا تھا۔

"امی بیگم لیجیے منہ میٹھا کریں۔" رابعہ بی بی خود ہی مٹھائی لے آئیں اور وہاں بیٹھے تمام افراد کا منہ میٹھا کرانے لگیں۔

٭ ٭ ٭

داد بخش پہلی فرصت میں شاہ میر کے پاس گیا تھا اور اس کی آفر قبول کر لی۔

"اس آفر کے ساتھ جو تم نے سہولیات پیش کی تھیں ان کا جلدی سے انتظام کرو۔۔۔" داد بخش نے گاڑی اور فلیٹ کی بات کی تھی۔

"کیا مطلب؟ اتنی جلدی کس لیے ہے؟" شاہ میر کو حیرانی ہوئی۔

"آج سے ٹھیک چھ دن بعد میری شادی ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کس کی؟ تمہاری؟" شاہ میر کو اچنبھا ہوا۔

"ہاں میری ہی۔۔۔"

"لیکن کس کے ساتھ؟"

"میرے ساتھ یار اور کس کے ساتھ؟"

"سچ؟" شاہ میر صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

"ارے یہ کیسے ہوا؟"

"بس یار! اب کچھ اتنا اچانک ہوا ہے۔" داد بخش آہستگی سے بولا۔

"تم فکر نہ کرو میں تمہارا فلیٹ ان چھ دنوں میں ایسا تیار کرواؤں گا کہ تمہیں خود پہ رشک آئے گا۔" شاہ میر نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"اور گاڑی؟"

"ہاں یار! فکر کیوں کرتے ہو تمہاری گاڑی کو دلہن کی طرح سجا کر دوں گا اور دولہا کو بھی۔" شاہ میر نے خوش دلی سے کہا۔

"شاہ میر! دولہا سجنے کی ضرورت نہیں۔" وہ اسے گھورتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔

"کیوں تمہیں شرم آ رہی ہے ویسے جس لاڑے (دولہا) کو شرم آتی ہے اس پہ روپ بھی بہت آتا ہے۔" شاہ میر ہنس کے بولا۔

"بتانے کا شکریہ۔" داد بخش نے کہا۔

"کیا ہم بھی انوائٹڈ ہیں؟"

"ارے یار! تم ہی تو انوائٹڈ ہو میری طرف سے اور ہے ہی کون؟ نہ ماں باپ نہ بہن بھائی نہ کوئی اور رشتہ دار' ایک دوست ہی تو ہے۔" داد بخش کے لہجے میں رنجیدگی اتر آئی تھی۔

"ارے یار اگر میں ہوں تمہاری طرف سے تو میں سارے رشتے نبھاؤں گا۔" شاہ میر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"تھینک یو شاہ میر! مجھے لگتا ہے اللہ نے تمہیں میری مدد کے لیے بھیجا ہے۔"

"اپنی وے تم یہ تاؤ سردار بیگم اور ان کی حویلی کا کیا کرو گے؟" شاہ میر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"شاہ میر! اگر سچ پوچھو تو میں سردار بیگم کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ نہ آج نہ کل' لیکن ایک بات اور ہے کہ میں اب حویلی میں رہنا بھی نہیں چاہتا' حالانکہ آج تک انہوں نے جو احسان اور کرم نوازیاں مجھ پہ کی ہیں وہ شاید ہی کوئی دوسرا بندہ کر سکتا ہو۔ لیکن میں اپنی بیوی کی ذمہ داری میں خود اٹھانا چاہتا ہوں۔ پہلی کمائی سردار بیگم کے ہاتھ پہ ہی رکھوں گا کیونکہ میری کمائی پہ پہلا حق ان ہی کا ہے' وہ میری ماں بھی ہیں اور باپ بھی جب تک وارث بڑا نہیں ہو جاتا میں حویلی کے تمام کام تمام ذمہ داریاں نبھاؤں گا جیسے پہلے نبھا رہا ہوں۔ لیکن ساتھ ساتھ اپنا کام بھی کروں گا۔ وارث ذمہ دار ہو گیا تو میں بالکل ہاتھ ہٹا لوں گا کیونکہ اگر اس وقت میں سب کچھ یہیں چھوڑ دوں تو سردار بیگم کو بڑی پرابلم ہو گی۔"

دلو بخش بغیر رکے بولتا چلا گیا تھا اور شاہ میر کو اس کے خیالات جان کر خوشی ہوئی تھی لیکن حویلی جا کر جب انہی خیالات کا اظہار اس نے سردار بیگم کے سامنے کیا تو وہ چپ کی چپ رہ گئی تھیں۔

"سردار بیگم! آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا بولوں؟ کیا بولنے کے لیے کچھ باقی ہے؟ تم سارا کچھ طے کر کے اب مجھ سے مہر لگوانے کے لیے آئے ہو؟"

"ہاں سردار بیگم! سب کچھ طے کر کے آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ آپ مجھے روک نہ سکیں' سردار بیگم! میں اگر یہاں رہا تو میری گردن اور میری نظر ہمیشہ کے لیے جھکی رہے گی۔ میری اوقات تو کیا میری ذات بھی نہیں رہے گی۔ میں گھر والوں کے کسی سے نظر نہیں ملا پاؤں گا۔ کبھی سر نہیں اٹھا سکوں گا' آپ کی اتنی محنتوں سے دلوائی ہوئی تعلیم رائیگاں جائے گی۔ سردار بیگم! پلیز دلو بخش کہیں بھی چلا جائے لیکن آپ کے قدموں کی خاک ہی رہے گا۔"

اس پہ کہتے کہتے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر چومتے ہوئے آنکھوں سے لگا لیے تھے۔

دلو بخش کی خودداری پر ان کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ ان کا انتخاب صحیح تھا۔ وہ خود بھی سوچتی تھیں کہ ان کی وفات کے بعد دلو بخش کا ٹھکانا کیا ہو گا۔ یہاں لوگوں کے رویے ان سے چھپے نہیں تھے ان کی زندگی میں یہ حال تھا تو ان کی وفات کے بعد نہ جانے کیا ہوتا تھا۔

"جاؤ میرے بچے! اللہ کامیابیاں تمہارے قدموں میں بچھا دے۔" انہوں نے اسے محبت پاش اور نم آلود آنکھوں سے اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر دعا دی تھی' دلو بخش نے بے ساختہ ان کی پیشانی چوم لی تھی۔

"تھینک یو اماں بیگم! تھینک یو سو مچ۔"

"تم مجھے اماں کہہ رہے ہو؟" وہ خوشی سے سرشار ہو گئیں۔

"ہاں اب میں خود سے نظر ملانے کے قابل ہو گیا ہوں' اب مجھے سردار بیگم نہیں اپنی ماں کی صورت نظر آ رہی ہے۔" وہ ان کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچ رہا تھا اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ سردار بیگم نے بچپن سے ہزاروں جتن کیے تھے کہ وہ انہیں اماں بیگم یا دادی بیگم کہے لیکن اس نے رکھی' رجائی اور امجد وغیرہ کی دیکھا دیکھی انہیں سردار بیگم ہی کہا تھا' وہ خود کو نوکروں کے دائرے میں رکھتا تھا لیکن آج وہ نوکروں کے دائرے سے نکل کر خود کو ایک رشتے کے دائرے میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں آزاد ہو چکے تھے۔ اس نے شاہ میر کو فون کر کے سردار بیگم کی رضا مندی بھی بتادی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس پر لگژری فلیٹ کا کونا کونا پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ شاہ میر نے دلو بخش کا بیڈ روم ہی نہیں بلکہ ڈرائنگ روم' کچن اور لاؤنج میں بھی پھولوں سے ڈیکوریشن کروائی ہوئی تھی اس فلیٹ میں قدم رکھتے ہی سفید موتیا اور سرخ گلابوں کے انبار نظر آ رہے تھے

اور مہک اٹھی۔ مسحور کن ہنسی کہ قدم تھم سے گئے تھے۔ دل کے تار' خوشبو کی شرارتوں سے بجنے لگے تھے۔ جذبات اتنے معطر اور پاکیزہ تھے کہ داد بخش کا انگ انگ پھول بن کر کھلا جا رہا تھا۔ حل کی حالت اس کی پیشانی پہ چمکتے قطروں سے نظر آنے لگی تھی اور وہ اسی مشکل کا شکار تھا کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار اس پاگل لڑکی کے سامنے کرے کا بھی تو کیسے؟

"داد بخش!" شاہ میر نے اسے پکارا۔

"ہوں؟"

"لگتا ہے تم خیالوں ہی خیالوں میں اپنے بیڈ روم میں پہنچ ہوا ہے؟" اس نے چھیڑا۔

"پہنچنا بھی چاہیے' آخر اتنا ٹائم ہو رہا ہے؟" شاہ میر کی امی نے اٹھتے ہوئے کہا آج شاہ میر کی فیملی بھی شادی میں شریک ہوئی تھی۔

"ارے نہیں آنٹی! آپ بیٹھیے نا' اتنی جلدی اٹھنے کی کیا ضرورت ہے؟" داد بخش نے انہیں روکا' وہ لوگ انہیں گھر تک چھوڑنے آئے تھے۔

"تم سب کے درمیان بیٹھے ہوئے ہو اس لیے تمہیں جلدی لگ رہی ہے' بیچاری دلہن اکیلی بیٹھی ہے' ہم سے یہ ٹائم بھی آدھی رات لگ رہا ہو گا' تم اس کے پاس جاؤ شاباش۔" انہوں نے کندھا تھپکا۔ داد بخش مسکراتے ہوئے دروازہ لاک کر کے اپنے بیڈ روم میں آگیا' اس وقت ساڑھے گیارہ کا ٹائم ہو رہا تھا لیکن تھکاوٹ کی وجہ سے رات خاصی گہری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کے اندر آیا تو قدموں کی روانی میں کمی آگئی' اندر ہر چیز ہی ہوش ربا تھی۔

"السلام علیکم!" اس نے بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے سلام کیا۔ مہلو ذرا سا پیچھے کھسک گئی تھی اور اس نے اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔ وہ اس کی اس حرکت میں چھپی ناراضی کو اچھی طرح سمجھتا تھا اسی لیے سر کھجاتے ہوئے سوچنے لگا کہ اب کیا کرے؟

"دیکھیے مہلو بی بی! میں آپ کا شوہر ہوں' لازم نہیں کہ آپ کے نخرے ہی دیکھتا رہوں۔" اس نے مہلو کا ہاتھ پکڑ کر اسے سامنے کر لیا تھا اور اس کا گھونگھٹ الٹ دیا تھا لیکن گھونگھٹ کے اندر مہلو ششدر سی حالت میں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔

"یہ سب تم نے کہا ہے؟" وہ حیرت زدہ تھی۔

"جی میں نے ہی کہا ہے اور یقیناً آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا؟" داد بخش نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا داد بخش!" وہ واقعی حیرانی کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔

"تو پھر میں آپ کو یقین دلا رہا ہوں۔" اس نے مہلو کو بازو کے حصار میں گھیرا تھا لیکن وہ جیسے ہوش میں آگئی تھی' یکدم تڑپ کے دور ہٹ گئی۔

"بس بس تم اپنے یقین اپنے پاس ہی رکھو' میرے پاس آنے کی اور مجھے چھونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' میں تمہارے لیے کیا ہوں' خوب جانتی ہوں میں۔" وہ تنک گئی تھی۔

"کیا جانتی ہیں آپ؟" اس نے مہلو کا بازو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا تھا۔

"یہی کہ میں زبردستی تم پہ مسلط کی گئی ہوں' تم نے دادی بیگم کی خاطر مجھے اپنایا ہے ورنہ تمہارے دل میں اور تمہاری زندگی میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں رتی برابر بھی اہمیت نہیں رکھتی تمہاری نظر میں۔" مہلو کو آج موقع ملا تو اپنے حساب کتاب کھول بیٹھی تھی۔

"سردار بیگم سے میرا کیا رشتہ تھا کہ وہ مجھے ایک دربار سے اٹھا کر گھر لے آئیں؟ مجھے تعلیم دلوائی محبت دی' عزت دی' میں ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا تھا کجا کہ ان کے گھر کی عزت پہ نظر ڈالتا۔ اور رہی آپ کی اہمیت تو اپنی اہمیت میرے رب سے پوچھیے جس سے میں دعائیں کرتا تھا اور ان دعاؤں میں آپ کے نام کے علاوہ کوئی اور نام نہیں ہوتا تھا۔" داد بخش کے لفظ لفظ سے سچائی کی مہک اٹھ رہی تھی۔

"تو پھر تم محبت سے انکار کیوں کرتے تھے؟"

"کیونکہ اس وقت میں اپنے آپ کو آپ کے قابل سمجھتا تھا۔ اس وقت میں خود محتاج تھا کسی کا دیا کھاتا تھا' آپ کو وہ سب نہیں دے سکتا تھا جس کی آپ عادی تھیں۔"

اس نے مہلو کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ مہلو کی نظر جھک گئی تھی۔۔۔ اور داد بخش نے اس کی جھکی پلکوں پہ اپنے ہونٹوں کا لمس سجا کر انہیں روشن کر دیا تھا' مہلو کی ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا اور دل کا پنچھی سینے کے پنجرے میں پھڑپھڑا کے رہ گیا۔

"داد!" اس کی گرفت میں استحقاق بڑھا تو وہ بول اٹھی تھی۔

"اپنی شدتوں کا تو ہمیشہ اظہار کیا آپ نے' اب میری شدتوں کو برداشت کیجیے۔ تو بس تماشا دیکھیے۔" اس کی آواز کی گمبھیرتا مہلو کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر گئی تھی۔

وہ ایسا رومانٹک بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ قطرہ قطرہ پگھلتی رات ان کے ملن پہ کھل کے مسکرائی تھی۔۔۔!

☆ ☆ ☆

صبح فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو اس کی پہلی نظر مہلو کے چہرے پہ گئی تھی۔ وہ اس کے بازو پہ سر رکھے سو رہی تھی لیکن نیند میں بھی دھیمی سی مسکان نے اس کے لبوں کا احاطہ کر رکھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ دائمی مسکان اس کے لبوں پہ ہمیشہ کے لیے ٹھہر گئی ہو۔۔۔ لیمپ کی مدھم روشنی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی اور داد بخش اپنی سوئی ہوئی ملکیت سے نظریں نہیں ہٹا سکا تھا اور بے اختیار اس کے چہرے پہ جھکتے ہوئے اس کی مسکراہٹ میں اپنی مسکراہٹ کے رنگ بھر دیے تھے اس کے لمس پہ مہلو کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔ وہ کہنی کے بل پہ اس کی سمت جھکا ہوا تھا۔

"تم جاگ رہے ہو؟"

"خوش قسمتی سے آنکھ کھل گئی۔"

"لیکن اس وقت؟" مہلو نے نظر گھما کے سائیڈ ٹیبل پہ دھرے گھڑی کو دیکھا۔ اس کی اپنی آواز اور آنکھیں نیند کی وجہ سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

"آپ پریشان نہ ہوں' میں آپ کے لیے نہیں جاگ رہا' میں تو نماز پڑھنے کے لیے جاگ رہا ہوں۔" اس نے مہلو کے بال چہرے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا اور اپنی انگلی سے اس کے نرم شفاف گلابی ہونٹوں کو چھونے لگا۔

"تو پھر جاؤ نماز پڑھو۔"

"ابھی چند منٹ ہیں نماز میں' ابھی اذان نہیں ہوئی۔" وہ پھر کسی گستاخی کے ارادے سے اس پہ جھکا لیکن مہلو نے تیزی سے اس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کے روک دیا تھا۔

"بہت بے شرم ہو تم' کہاں تو نظر اٹھا کر دیکھتے ہی نہیں تھے اور کہاں اب نظر ہٹا ہی نہیں رہے؟" اس نے حیرت سے کہا تھا۔

"اگر نظر ہٹاؤں تو پھر آپ کو ہی شکوہ ہو گا کہ میں نظر بھر کے دیکھتا ہی نہیں؟" اس نے شرارت سے کہا۔

"مہلو جی! ایک بات تو بتاؤ؟"

"اف ایک تو یہ "بابا" اور "چچا" نجانے کب چھوڑو گے؟"

"تو اور کیا کہوں؟" وہ مسکراہٹ دبا کے بولا۔

"داد بیگم۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"داد بیگم؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں میری بڑی خواہش ہے کہ جس طرح لوگ دادا جان کے نام سے دادی بیگم کو "سردار بیگم" کہتے ہیں اسی طرح مجھے بھی تمہارے نام سے "داد بیگم" کہہ کے پکاریں۔" اس نے حکم بجا لایا۔

"اور یہ تم مجھے آپ کے بجائے "تم" کا درجہ کب دو گے؟" اس نے گھور کے پوچھا۔

"جب آپ مجھے تم کے بجائے "آپ" کا درجہ دیں گی۔" داد بخش کا جواب برجستہ تھا۔ مہلو اپنی غلطی پہ چپ ہو گئی بلکہ کچھ کچھ کھسیا گئی تھی۔

"آئی ایم سوری۔۔۔"

"اٹس او کے آئندہ سہی۔" وہ ہنسا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دوسری حویلی سے ساجد وغیرہ بھی آ گئے۔ تاہم ملی تو اطلاع ملتے ہی ہسپتال پہنچ گیا تھا بنا جیسے سب کو خبر ملتی رہی تھی سبھی پریشان ہو رہے تھے۔

"اللہ! اس پہ گولی رمیز نے چلائی ہے" یہ کام وہی خبیث کر سکتا ہے' ورنہ دلو کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے بھلا؟" مہرو ہچکیوں کے درمیان بولی تھی۔

"بس بیٹا! ہم کیا کہہ سکتے ہیں اب؟ یہ تو پولیس ہی بتائے گی کہ کس کا کام ہے؟" زاہدہ بی بی بغیر کسی تصدیق کے رمیز پہ الزام نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔

✿ ✿ ✿

"دلو...!" وہ بے تاب سی اندر داخل ہوئی تھی۔ دلو بخش نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اسے آج ہسپتال چھوڑ کے گیا تھا۔

"کیسی ہو؟"

"آپ کیسے ہیں؟ کب ڈسچارج ہوں گے؟ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟" اس نے دلو کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"اف تمہاری یہ بے تابیاں اور جلد بازیاں۔" وہ دھیمے سے مسکرایا' "شروع سے ہی ایسی ہو' جذباتی اور جنونی...!"

"میں صبر نہیں کر سکتی۔ آپ کے معاملے میں تو ہرگز نہیں۔"

"یار صبر کس کافر کو آتا ہے؟ مجھ سے پوچھو میں صبر کی کس انتہا پہ ہوں' تم سامنے کھڑی ہو اور میں بے بس۔" دلو بخش کی معنی خیز بے باک نظر مہرو کے چہرے کا طواف کر رہی تھی مہرو نظر چرانے پہ مجبور ہو گئی۔

"پلیز دلو! مجھے باتیں مت۔ یہ بتائیں طبیعت اب کیسی ہے؟"

"تم آ گئیں اور میں ٹھیک ہو گیا' کہو تو اٹھ کر بیٹھ جاؤں؟"

"جی نہیں... آپ آرام کریں۔" وہ گھبرا گئی تھی "... ڈاکٹر سے کہو جلدی ڈسچارج کر دے کہیں دل کے

"خون ہو رہی ہے۔"

"میں جانتا ہوں' آپ بھی اٹھ کر فریش ہو جائیں اور نماز پڑھ لیں۔" وہ کمبل ہٹا کر اٹھ گیا تھا اور نہا کر نماز پڑھنے کے لیے مسجد چلا گیا اس کے پیچھے مہرو بھی اٹھ گئی تھی اس نے شاور لیا' وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

نماز پڑھنے کے بعد وہ کھڑکی سے پردے ہٹا کر سورج کی نوخیز کرنوں سے لطف اندوز ہونے لگی تھی لیکن دھیان اب بھی دلو بخش کی طرف ہی تھا۔

"دلو بخش! میں تمہیں اپنے دل سے سلام پیش کرتی ہوں' تم نے اپنے مضبوط کردار کے بل بوتے پہ سردار بیگم کا دل بھی جیت لیا اور مہرو ولی محمد کو بھی۔ آج میں یہاں ہوں تو صرف تمہاری ایمانداری' دیانت داری اور کردار کی وجہ سے' ورنہ یہاں ایسا کوئی مرد نہیں جو اپنی طرف بڑھنے والی لڑکی کا ہاتھ جھٹک دے یا اس کے وجود سے نظریں چرا لے۔ تم میرا نصیب بنے ہو تو میں واقعی خوش نصیب ہو گئی ہوں آئی ایم رئیلی پراؤڈ آف یو۔" وہ کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگائے اپنی سوچوں کے دوش پہ نجانے کہاں سے کہاں پہنچی ہوئی تھی...!

✿ ✿ ✿

آج شادی کے دو دن بعد مہرو گاؤں جا رہی تھی۔ سردار بیگم نے مہر نگار' وارث اور راجعلی بی بی کو لینے کے لیے بھیجا تھا۔ دلو بخش کو شاہ میر کے ساتھ مل کر کوئی میٹنگ طے کرنا تھی اس لیے مہرو کو رخصت کر کے آفس چلا گیا تھا لیکن سردار بیگم نے 12 سے بارہا فون کر کے آنے کی تاکید کی تھی اور اس نے ہامی بھی بھر لی تھی۔

ایک گھنٹے بعد وہ فارغ ہوا تو گاؤں کا رخ کیا تھا لیکن گاؤں میں داخل ہوتی سڑک کے بیچوں بیچ کسی کی بائیک اوندھی پڑی تھی وہ تین بار اس نے گاڑی کا ہارن دیا لیکن کوئی پتہ نہ چلا کہ بائیک کا مالک کون ہے؟ اور کہاں ہے؟ وہ گاڑی روک کے نیچے اتر گیا تھا جیسے ہی اس بائیک کو ہٹانے کے لیے آگے بڑھا ایک سنسناتی ہوئی گولی اس کا نشانہ سا جھپٹ کے رکھ گئی تھی۔ دلو بخش اک کراہ کے ساتھ پلٹا تھا۔ سڑک کے قریب جھاڑیوں میں اسے رمیز کی شکل نظر آئی تھی لیکن دوسری گولی اس کے بازو کو چیرتی ہوئی گزر گئی تھی وہ یکدم زمین پہ گرا تھا اتنے میں لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔ رمیز بائیک لے کر رفو چکر ہو گیا تھا۔ دلو بخش اسے اچھی طرح پہچان چکا تھا' گاؤں کا چاچا بشیرا لوہار ہاتھ میں درانتی پکڑے سب سے پہلے دلو بخش تک پہنچا تھا۔

"اوئے دلو بخش! اوئے کیا ہو گیا؟ گولی کس نے چلائی؟ کون تھا؟"

"بشیرے لوہار کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اس نے دلو بخش کا سر اٹھا کر گود میں رکھا تھا لیکن اتنے میں اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں اور اتفاقاً" دوسری حویلی کا ڈرائیور امتیاز گاڑی لے کر آ گیا' وہ بھی دلو بخش کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا! اور پھر وہاں جمع ہونے والے تمام کسانوں نے مل کر اسے گاڑی میں ڈالا اور ہسپتال لے گئے تھے' ادھر کچھ حویلی کی طرف دوڑ پڑے تھے حویلی میں بھی جس جس کو پتہ چلا وہ دھک سے رہ گیا تھا۔

✿ ✿ ✿

مہرو چونک کر اٹھی تھی۔ نہ جانے کیسا خواب دیکھا تھا۔ اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا' اس نے دلو بخش کے بارے میں پوچھا تھا اور یہ جان کر کہ وہ ہسپتال میں ہے اس پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔

"اف خدایا! مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" وہ چکرا کر گرنے لگی تھی کہ مہرو نے اٹھ کر اسے تھام لیا تھا۔

"مہرو! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے خود کو سنبھالو' دلو اب ٹھیک ہے۔ دادی بیگم کا فون آیا تھا۔ پولیس کو بھی اطلاع کر چکی ہیں۔" مہرو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ یکدم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی تھی۔ وہ بچوں کی طرح بلک رہی تھی اور راجعلی بی بی اسے چپ کرواتے ہوئے تسلی دینے لگیں۔

اماں، میں یہاں نہ رہ جاؤں! پہلے ہی آپ سے "تم" تک آتے آتے عمر گزر گئی ہے بھئی! قسم سے یار ایوں لگتا ہے تمہاری چاہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔" مہرو اس کے افسردہ سے انداز پہ یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی۔

"ظاہر ہے میں اکیس سال کی کمسن دوشیزہ اور آپ تیس سالہ مرد 'اف اتنی ایج۔'" اس نے منہ بنا کے کہا۔

"بس بس زیادہ دوشیزہ بننے کی بھی ضرورت نہیں ہے تمہاری شادی ہو چکی ہے اب۔" داد بخش نے چڑایا۔

"بہت تیز ہو گئے ہو؟"

"تمہارے ساتھ کا کمال ہے؟"

"کیا کہا؟" وہ چیخی۔

"ایک بات مانو گی؟"

"ہوں کہیں؟"

"اماں بیگم سے کہو کیس واپس لے لیں، رمیز کو آزاد کروا دیں ۔۔۔ تین دن سے وہ جیل میں ہے اور پولیس والوں کی مار کھا رہا ہے۔ چیز دارا میں کسی کی اذیت کا سبب نہیں بن سکتا۔ یوں سمجھ لو میں نے تمہارے صدقے اور اپنی خوشیوں کے صدقے اسے معاف کیا۔" داد بخش نے مہرو کا ہاتھ پکڑ کر اسے سمجھایا۔

"دادی بیگم اسے معاف نہیں کریں گی اور وہ معافی کے قابل نہیں ہے اس نے دو بار ہمیں قتل کرنے کی کوشش کی ہے ایک بار میری عزت پہ ہاتھ ڈال کر اور ایک بار آپ پہ گولی چلا کر۔"

"یار غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے اور معاف بھی انسان ہی کرتے ہیں پلیز کوشش کرو کہ اماں بیگم مان جائیں۔"

داد بخش نے اسے راضی کرنا چاہا مہرو چپ ہو گئی تھی لیکن سردار بیگم اپنے اصولوں سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھیں سب نے کوشش کر کے دیکھ لی تھی لیکن وہ نہیں مانی تھیں اور پورا ایک سال گزر گیا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے لگتا ہے یہ پورے کا پورا اماں بیگم پہ گیا ہے۔" داد بخش نے سردار بیگم کی گود میں لیٹے ننھے بچے کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

"اور مجھے لگ رہا ہے کہ یہ پورے کا پورا تم پہ گیا ہے۔" سردار بیگم نے مسکرا کر داد بخش کو دیکھا۔

"واہ جی واہ ۔۔۔ بیٹا میرا ہے اور لگ آپ جیسا رہا ہے کیا کمال کی بات ہے 'ہونہہ آپ دونوں کو اپنے سوا بھی کوئی نظر آتا ہے یا نہیں؟ یہ میرے جیسا بھی تو ہو سکتا ہے؟" مہرو ان دونوں کی نوک جھونک پہ ہنس رہی تھی اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوئے آٹھ دن ہو چکے تھے پہلے چھ سات دن مہرو، نگار اور رابعہ بی بی اس کے پاس وقتے سے آ کر رہی تھیں اور اس کی دیکھ بھال کرتی رہی تھیں اب وہ گئی تھیں تو داد بخش کی فرمائش سردار بیگم آ گئی تھیں اور ان کے ساتھ ان کی لاڈلی اور چہیتی رجالی بھی آئی ہوئی تھی۔

"بیٹے ہمیشہ باپ کا رتو ہوتے ہیں۔" سردار بیگم نے مہرو کے سر پہ چپت لگائی۔

"لیکن بیٹوں کو زیادہ پیار ماؤں سے ہی ہوتا ہے۔" مہرو اترا کے بولی۔

"بیٹے مجھے اماں بیگم سے ہے۔" داد نے ان کے کندھے پہ بازو پھیلایا۔

"ہاں اسی لیے تو میری ساری باتیں چوری چھپے جا کر ان کو بتاتے تھے؟" وہ مصنوعی خفا سے لہجے میں بولی اور داد بخش قہقہہ لگا کے ہنس پڑا تھا اور سردار بیگم بھی اپنی ہنسی نہیں روک سکی تھیں۔

"ابھی تک صدمہ ہے بے چاری کو۔"

"ہاں تو اور کیا مجھے کیا پتہ تھا کہ اندر ہی اندر میری جڑیں کاٹی جا رہی ہیں میری مخبری کی جا رہی ہے۔" اس کی خفگی پہ وہ دونوں ہنس رہے تھے کہ اتنے میں ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔

"شاہ میر بھائی ہوں گے۔" اس نے اندازہ لگایا۔ "میں دیکھتا ہوں۔" وہ اٹھ کر باہر آ گیا اور دروازہ کھول دیا لیکن سامنے راشدہ بیگم کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"آپ؟"

"ہاں میں تم سے کچھ مانگنے آئی ہوں داد بخش! اللہ کے واسطے مجھے مایوس مت کرنا۔" راشدہ بیگم نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ پلیز اندر آ جائیے۔" وہ سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

"داد! کہاں رہ گئے آپ؟ کون ہے باہر؟" مہرو کی آواز سنائی دی تھی۔

"بیگم صاحب آئی ہیں۔" وہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے بولا جس پہ وہ دونوں چونک گئی تھیں۔

"میں کسی سے بھی کچھ کہنے نہیں آئی میں بس اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔" راشدہ بیگم نے سردار بیگم اور مہرو کی طرف دیکھ کر داد بخش کو دیکھا تھا۔ "خدا کے واسطے داد بخش! رمیز کو معاف کر دو اسے ایک سال ہو گیا ہے عدالت کی پیشیاں بھگتتے ہوئے۔ اب اس کا برا حال ہو چکا ہے اس نے جو کیا وہ واقعی برا کیا وہ اپنی سزا بھگت چکا ہے۔ بس کیس واپس لے لو۔" راشدہ بیگم نے ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے داد بخش نے ایک نظر سردار بیگم کو دیکھا۔ وہ رخ موڑ گئی تھیں۔ داد بخش نے آگے بڑھ کے راشدہ بیگم کے ہاتھ کھول دیے تھے۔

"آپ میری ماں کے برابر ہیں، ہاتھ جوڑ کر مجھے گناہ گار مت کیجئے، میں نے تو اسی وقت رمیز کو معاف کر دینے کا کہہ دیا تھا جب اسے پولیس نے پکڑا تھا لیکن اماں بیگم کے اصول کے مطابق اسے سزا ملنی چاہیے تھی، جہاں تک میرا تعلق ہے میں اسے کھلے اور سچے دل سے معاف کرتا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں میں کل ہی وکیل صاحب سے بات کر کے کیس واپس لینے کی درخواست پیش کرتا ہوں۔"

داد بخش کے فیصلے پہ سردار بیگم نے چونک کر دیکھا تھا جبکہ راشدہ بیگم کے چہرے پہ خوشی اور بے یقینی کے سائے لہرا گئے تھے۔

"اور اماں بیگم؟" راشدہ بیگم نے کسی خدشے کے تحت کہا۔

"اماں ۔۔۔ میری ماں ہیں نا میری بات سے انکار نہیں کریں گی آپ بیٹھئے اور چائے پی کر جائیے گا۔" داد بخش نے کتنے یقین سے کہتے ہوئے راشدہ بیگم کو صوفے پہ بٹھایا تھا اور راشدہ بیگم شرمندہ ہو کے رہ گئی تھیں انہیں اپنا رویہ یاد آ گیا تھا۔

"مہرو! رجالی سے کہو چائے لے کر آئے۔" اس نے اشارہ کیا۔

"جی ابھی کہتی ہوں۔" وہ فوراً اٹھ گئی۔

"راشدہ بیگم! یہی فرق ہے میری تربیت میں اور تمہاری تربیت میں، تمہارا اپنا ہی بیٹا تمہارے اختیار میں نہیں، جبکہ میرے بیٹے نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ جاؤ میں اپنے داد کے صدقے تمہیں اور تمہارے بیٹے کو معاف کرتی ہوں۔"

سردار بیگم نے دل پہ رکا گلا کھول دیا تھا۔

راشدہ بیگم نے آج سچے دل سے تسلیم کیا تھا کہ انسان کی عظمت اس کی بڑائی اس کے خاندان اور دولت سے نہیں اس کے کردار سے ہوتی ہے۔

☆